کرشن چندر

ایک کروڑ کی بوتل

ایک کروڑ کی بوتل

ایک کروڑ کی بوتل

کرشن چندر

مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور

ناشر ..... نواز
مطبع ..... معظم پرنٹرز لاہور
قیمت ..... -/۱۸ روپے

ایک

"تو پھر تمہاری ماں نے کیا کہا؟"
لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔

میرین ڈرائیو سمندر کی لمبی دیوار، نیم دائرے کی صورت میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اُن کی پیٹھ میرین ڈرائیو کی بلڈنگوں کی طرف تھی۔ اور چہرے سمندر کی جانب!

بادل گھر آئے تھے۔ سمندر کا پانی ایک وحشیانہ خوشی سے اُچھل رہا تھا۔ جیسے اُسے کبھی معلوم ہو کہ بارش آنے والی ہے۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ صرف انسان کو معلوم دیتا ہے۔ کچھ باتیں سمندر کے علم میں بھی آتی ہیں۔

کچھ باتیں بادل بھی جانتے ہیں!

کچھ باتیں ہوا بھی سونگھ لیتی ہے!!

صرف لہروں پر اڑتی ہوئی جھاگ کچھ نہیں جانتی۔ کیوں کہ اس نے صرف خوشی دیکھی ہے۔ کچھ جاننے کے لئے دُکھ اُٹھانا ضروری ہے!

اُن دونوں نے بلڈنگوں کی طرف سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ کیوں کہ وہاں کوئی امید نہیں تھی۔ سامنے سمندر کا پُراسرار چہرہ تھا۔ ہوا میں ایک خطرناک سازش تھی۔ اور انسانوں کے چہروں پر کسی پراسرار تکلیف کی پرچھائیں ملتی تھی۔

لڑکی کی عمر مشکل سے اُنیس برس ہوگی۔

لڑکا تین چار برس بڑا ہوگا۔

مگر وہ تکلیف دہ ذہنی کشمکش ان دونوں کے چہروں کی سطح پر اس طرح تیر رہی تھی، جیسے سمندر کے ساحل پر کوڑا کرکٹ تیرتا ہے۔ مگر سمندر کا حصہ نہیں بن سکتا۔

اس طرح ان کے ذہنی کرب کے باوجود، ان دونوں کے چہروں پر نوعمری کی کشش تھی۔ اور اس کا بھولا پن تھا۔

بند کی دیوار پر دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ مگر اُن لوگوں نے اس جوڑے کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ میرین ڈرائیو کے آداب میں شامل ہے کہ لوگ ذرا فاصلہ چھوڑ کر ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً جوڑوں کے لئے زیادہ فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی دوسرا ان کی گفتگو میں حائل نہ ہو سکے۔ اور آج تو اتوار بھی نہیں تھا۔

اس لئے بھیڑ کم تھی۔

پھر بارش کا خطرہ تھا۔ اس لئے اس لمبی دیوار پر بہت کم لوگ بیٹھے تھے چند فلسفی بڈھے،

چند بیکار نکمے!

کچھ نئے شادی شدہ جوڑے!!

کچھ باہر سے آئے ہوئے دیہاتی!!! شائد جنہوں نے پہلی بار سمندر دیکھا

تھا ——————

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، اس قدر خشونت سے سمندر کو گھورتا ہوا۔ گویا ابھی خودکشی کرے گا۔

سمندر اور زمین کے درمیان نیم دائرے کی صورت میں پھیلی ہوئی اس لمبی دیوار پر زندگی کے بہت سے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

ڈوبنے اور ابھرنے کے۔

مرنے کے اور مارنے کے۔

عشق شروع کرنے کے اور عشق ختم کرنے کے۔

شادی کرنے کے اور طلاق دینے کے۔

شائد سمندر کو دیکھ کر فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ سمندر کی طرف دیکھنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اپنے اندر جھانکنا۔

سمندر بھی انسان کو اپنے شعور کی یاد دلاتا ہے۔ شعور کی اور تحت الشعور کی۔ اور لاشعور کی۔ کیوں کہ انسان کے ذہن کی طرح سمندر کی بھی لاانتہا تہیں اور پرتیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو سمندر کے چہرے میں اتنی کشش ہوتی ہے۔

لڑکے نے لڑکی کی طرف دیکھ کر پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تو پھر تمہاری ماں نے کیا کہا؟"

"وہ میں سن نہیں سکی۔" لڑکی نے اپنے بھورے بالوں کی لمبی چوٹی سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں کہ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بہت آہستہ سے باتیں کرنے لگے۔"

لڑکی بہت بےچین اور پریشان نظر آتی تھی۔ اور اس کی لمبی انگلیوں کی پوریں اس کے بھورے بالوں کی چوٹی میں گھسی ہوئی گلاب کی کلیوں کی

طرح دکھائی دیتی تھیں۔
کبھی یہاں۔
کبھی وہاں۔
جیسے اس کے ہاتھ اُن گنتی ہوئی لٹوں میں پھنسی ہوئی کسی اُلجھن کو نکالنے کے درپے ہوں مگر وہ اُلجھن کسی طرح سُلجھ نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔
سمندر کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی!
بلکہ گردن اٹھائے، کسی دور کے اُفق پر، اپنی بے چین نگاہوں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔
لڑکا لڑکی کے لباس کو بڑی ملائمیت سے چھو کر بولا۔
"اور یہ ڈریس؟"
ڈریس بڑا شاندار تھا۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا ریشمین بلاؤز اور گہرے زعفرانی رنگ کے سکرٹ نے اس کی سڈول لمبی ٹانگوں اور سنہری باہوں اور سینے کے برف رنگ اُبھار کو نمایاں کرتے ہوئے، لڑکے کے دل میں ہیجان پیدا کر دیا۔
وہ اِندو کو اپنی باہنوں میں لے کر سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ مگر اوپر بادل اور نیچے سمندر دیکھ رہا تھا۔
اور ——————
اُن کے پیچھے میرین ڈرائیو کی بلڈنگوں کی سینکڑوں آنکھیں تھیں۔ اور رنجیت نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب صرف ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔
جب اِندو نے رنجیت کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، تو اس

نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسی سوال کو دوسرے طریقے سے پوچھا۔

"مگر اندو تم تو یہ مغربی ڈریس کبھی پہنتی نہیں ہو؟"

اندو نے آہ بھر کے کہا۔

"وہی لایا تھا!"

"پھر تم نے کیوں پہن لیا؟"

"ماں نے زبردستی پہنوا دیا، اس کے سامنے! وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ پھر جب تک بیٹھا رہا للچائی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی لعاب دار کیڑا میرے جسم پر رینگ رہا ہو۔"

اندو کے سارے جسم میں کراہیت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا سارا بدن چند ساعتوں کے لئے کانپ گیا۔

وہ پہلی بار رنجیت کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"معلوم نہیں ان سب بڈھوں کی نگاہوں میں ایک گیلی گیلی چلبلی سی کیفیت کیوں ہوتی ہے؟"

"زندگی پر سے ان کی پکڑ ڈھیلی جو ہو جاتی ہے!" رنجیت نے جواب دیا۔

پھر ذرا رک کر پوچھنے لگا۔

"تمہیں میری نگاہیں کیسی لگتی ہیں؟"

"اُم ——" وہ شریر نگاہوں سے اُسے تاکتے ہوئے بولی۔

"کیوں بتاؤں؟!"

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور اس وقت اگر اُوپر سے بادل اُسے دیکھتے تو انہیں بھی لگتا۔ جیسے بند کی دیوار کی کسی دراڑ سے یکایک ایک سنہرا

پھول ابھر آیا ہوا!

اندو اس ڈریس میں بہت اچھی دکھائی دے رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں کی ایک نظر اس پر ضرور پڑتی تھی۔ اسی لئے تو ان دونوں نے اپنی پیٹھ فٹ پاتھ کی طرف کر لی تھی۔

پھر بھی اندو ان نگاہوں کا لمس اپنی پیٹھ پر محسوس کر سکتی تھی۔

"پھر بھی اگر تم یہ ڈریس نہ پہنتی تو اچھا ہوتا۔ حالاں کہ بہت جچ رہی ہو اس میں!"

اندو نے کہا۔

"ہاں۔ پہلے تو میں نے بھی سوچا کہ انکار کر دوں۔ پھر خیال آیا، آج شام کو تم ملو گے، یہاں پر۔ اس لئے تمہاری خاطر پہن لیا اسے!!"

رنجیت کی نگاہوں میں خوشی کی ایک چمک پیدا ہوئی اور اندو کے ہونٹوں سے ہنسی کی لڑیاں سی پھوٹیں۔ بولی۔

"اس بڈھے نے یہی سمجھا۔ میں اس کی خاطر پہن رہی ہوں۔" وہ کچھ دیر تک اسی خیال سے محظوظ ہو کر ہنستی رہی جیسے اس نے اس بڈھے کو سخت چرکا دیا ہو۔

پھر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"گگن بھائی کہہ رہا تھا، اسے مغربی ڈریس بہت پسند ہے اور اس نے اپنے دفتر کی ہر ٹائپسٹ کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ہمیشہ مغربی ڈریس پہن کر اس کے دفتر میں آیا کریں۔ مگر ایک لڑکی بھی تو اندو ایسی نہیں ہے۔ وہ میری ماں سے کہہ رہا تھا۔

'تم بھی اسے صرف یہی ڈریس پہنایا کرو!'

اس پر میری ماں بولی۔
"روز کیسے؟ میری اندو تو سال میں ایک دفعہ بھی ایسا ڈریس
نہیں پہن سکتی۔ تم کو تو معلوم ہے ہم کتنے غریب ہیں؟"

اس پر وہ بولا۔
"تمہاری غریبی ایک دن میں دور ہو سکتی ہے اگر.....!"

"تو پھر تمہاری ماں نے کیا کہا؟"
"وہ میں سن نہیں سکی۔" اندو اپنے بھورے بالوں کی چوٹی سے کھیلتے ہوئے
بولی۔ "وہ دونوں مجھے دیکھ کر یکایک بہت آہستہ سے بولنے لگے۔"

وہ دونوں پھر اداسی میں کھو گئے۔
انہیں ایسا لگا۔ جیسے گھرے بادلوں کی چادر صرف انھیں دبوچنے کے
لئے دھیرے دھیرے آسمان سے نیچے اتر رہی ہے۔ جیسے سمندر کا پانی کسی
وحشیانہ اندھی مسرت سے مغرور ہو کر،
اپنی لہروں کی لمبی لمبی باہیں پھیلا کر،
اُن کی گردن پکڑنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔
ہوا یکایک رک گئی تھی۔
جیسے زمین اور آسمان دونوں مل کر ان کے خلاف سازش کر رہے
ہوں۔

"کیسی چپ سی شام ہے؟"
رنجیت آہستہ سے بولا۔
اندو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچ سوچ کر رنجیت نے پوچھا۔
"وہ جھلا ایمبرائیڈری ورکشاپ سے مسز مہتہ نے تمہاری ماں کو

بلایا تھا نا؟"

"ہاں! پر وہاں کام کرنا میری ماں کو منظور نہیں ہے!"

"کیوں نہیں ہے؟"

"وہ میری ماں کو سو روپیہ پگار دیں گے۔ مجھے اسّی روپیہ۔ کیوں کہ میرا کام ابھی اچھا نہیں ہے!"

"ایک سو اسّی روپیہ مہینہ کم نہیں ہوتے!"

رنجیت نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

اندو کچھ دیر چپ رہی۔ جیسے اندر ہی اندر کسی بات کو دبانا چاہتی ہو۔ پھر ایکدم بھڑک کر بولی۔

"وہ بڈھا میرے دس ہزار روپیہ دیتا ہے۔"

"تمہاری ماں کو؟!"

"ہاں!"

"تم سے شادی کرے گا؟"

"نہیں۔ رکھے گا۔" اندو سسک کر بولی۔ "اس کے تو بڑے بڑے بچے ہیں۔ اس کی دو لڑکیاں مجھ سے بھی بڑی ہیں!"

"پھر تمہاری ماں نے کیا کہا؟"

"وہ مشائد زیادہ مانگتی ہے۔ وہ کہتی ہے میں نوکری کیوں کروں؟ میں اس بڈھے سے زیادہ رقم لے کر خود درزی کی دوکان کیوں نہ کھول لوں! کل کو اگر یہ تمہیں چھوڑ بھی دے گا، تو تم میرے پاس واپس آسکو گی۔ تمہارے لئے سڑک یا فارس روڈ کا کوٹھا نہیں ہوگا۔ اپنی چھوٹی سی کشیدہ کاری کی دوکان شاپ ہوگی۔ ساری عمر ہم نے جھگی، کھولی، جھونپڑا بستی میں کاٹی ہے۔ اب یہ

ایک چانس ملا ہے۔ اُسے کیوں چھوڑیں۔ اس نے ابھی تو یہ سب کچھ مجھ سے نہیں کہا۔ پر اس کی آنکھیں کہتی ہیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"پھر وہ تم سے صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی؟"

"اس لئے کہ وہ مجھ سے صاف صاف جواب نہیں سننا چاہتی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہ میرا بھاؤ بڑھا رہی ہے!"

رنجیت نے پُر اُمید لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے اس میں ہمیں کچھ وقت اور مل جائے!"

"کتنا وقت تم اور چاہتے ہو؟" اِندو نے ذرا تنک کر کہا۔ "دو سال سے میں تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوں!

کیسے کیسے حیلے، جتن کر کے میں نے اب تک اپنی ماں کو اور اس کے پاس آنے والے بڈھوں کو ٹالا ہے؟ مگر یہ بڈھا ٹلتا دکھائی نہیں دیتا۔ سات مہینے سے روز آ رہا ہے!"

رنجیت نے اندو کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

خود اس کے ہاتھ بڑے سخت تھے کیوں کہ وہ بھاسکر موٹر گیراج میں موٹر میکینک کا کام سیکھ رہا تھا۔ اور ابھی اُسے صرف ستر روپیہ ملتے تھے۔ یہ گیراج اس کے باپ کا تھا۔ مگر اس کا سخت گیر باپ، اس سے گیراج میں کام کرنے والے دوسرے نوکروں کی طرح سلوک کرتا تھا۔ اور جیب خرچ کے لئے صرف ستر روپیہ دیتا تھا۔

بھاسکر نے اپنے بیٹے رنجیت کو میٹرک سے آگے نہیں پڑھایا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے بعد گیراج کا مالک بنانا چاہتا تھا۔

کام کرنے والا مالک!

عیش کرنے والا مالک نہیں!!

کیوں کہ گو بمبئی میں بہت سے گیراج ہیں مگر چلتے وہی ہیں، جن کے مالک خود سے کام کرتے ہیں اور مشین کے ایک ایک پرزے سے واقف ہوتے ہیں۔ یہی واقفیت وہ رنجیت کو ودیعت کرنا چاہتا تھا۔ اور رنجیت بھی دل لگا کر محنت کرنا چاہتا تھا۔

مگر اس کا آدھا دل کام میں لگتا تھا۔ آدھا دل ہمیشہ کہیں اور رہتا تھا۔ اور مشینوں کے اوپر دھندلے دھندلے گلابی خواب منڈلاتے رہتے تھے۔ اور وہ بہت سی غلطیاں کر جاتا تھا۔ جس سے اس کا سخت گیر باپ اور بھی خفا ہوتا تھا۔

ایک روز رنجیت نے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں سے اندو کے سنگ شادی کا ذکر بھی کیا تھا۔ تو کئی دن تک اس کی گھر میں وہ گت بنی تھی۔ وہ گت بنی تھی کہ اب اس نے شادی کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اندو سے اس کا ذکر اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

اور ——————

اسے ہمیشہ یہی تسلی دی تھی کہ ایک نہ ایک اس کا سخت گیر باپ اس پر ضرور مہربان ہو جائے گا۔

"مگر کب؟"

جب اندو اس سے یہ پوچھتی تو وہ اس کے ہاتھ اپنے سخت ہاتھوں میں لے کر رہ جاتا۔

اندو کے ہاتھ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھے۔ مگر ملائم نہیں تھے۔ بانہہ کے دوسرے حصّوں کی طرح اندو کی ہتھیلیاں نرم نہیں تھیں۔ حالانکہ دیکھنے میں اس کی لانبی لانبی انگلیاں مومی قاموں کی طرح نظر آتی تھیں۔ مگر گھ

داری، جھاڑو کٹکا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا، ان سب کاموں نے اس کی ہتھیلیوں کو پتھر کی طرح سخت بنا دیا تھا۔

پہلے تو اِن ہتھیلیوں کا لمس رنجیت کو کھل جاتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے محبت کی آنچ میں وہ موم قلیں پگھلنے لگتیں اور ان کا لمس پھول کی پتی کی طرح لطیف اور ملائم ہو جاتا۔ پھر اندو کی انگلیاں۔ رنجیت کی انگلیوں میں گھل سی جاتیں۔

"اب میری ماں زیادہ وقت نہیں لے گی!"

اِندو کی درد بھری آنکھوں میں ایک گھمبیر سوچ آنے لگی۔

رنجیت کچھ بولا نہیں، مگر وہ سوالیہ نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں کہ ایک اور بھی لڑکی ہے!" اندو کے دل میں عورت کی رقابت جاگ اٹھی "بڈھا اس میں بھی دل چسپی لیتا ہے۔"

"رانی بالا!"

رنجیت نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

اندو نے چونک کر پوچھا۔

رنجیت کو اس لئے معلوم تھا کیوں کہ اِندو پر دل آنے سے پہلے اس کا دل رانی بالا پر بھی آیا تھا۔

رانی بالا اِندو کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔

اور اس جھونپڑی پٹی میں رانی بالا اور اندو ہی دو ایسی غریب لڑکیاں تھیں جن کا حُسن اس علاقہ میں کسی شہرت کا محتاج نہ تھا۔ رانی چنچل سبھاؤ کی تھی۔

اور اندو سے عمر میں ڈو سال کم بھی تھی۔

اس کا حسن ایسا تھا جو موٹر ڈرائیوروں اور کالج کے نوعمر چھوکروں کو سیٹی بجانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس کے حسن کا نمک اور تیکھا پن پچاس گز کے فاصلے سے محسوس ہونے لگتا تھا۔ بالعموم ایسا حسن بہت جلد کھلتا ہے اور بہت جلد مرجھاتا بھی ہے۔ اس کا نشہ پائیدار نہیں ہوتا۔ مگر جب تک ہوتا ہے، بہت تند اور تیز ہوتا ہے۔

رنجیت نے پہلے چند دنوں میں ہی محسوس کر لیا تھا۔

پھر ——!

رانی بالا کے عاشقوں میں آوارہ مزاج چھوکروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کی ماں تین چار گھروں میں برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی۔ مگر اس سے آج کی مہنگائی کے زمانہ میں کہاں پورا پڑتا ہے۔

رانی کا باپ چار سال پہلے ایک مل میں نوکر تھا۔ مگر ایک حادثہ میں اپنا دایاں بازو کٹوا بیٹھا تھا۔ اور اپنے بازو کی جو قیمت اُسے مل سے ملی تھی، وہ اسے چار سالوں سے کھا کر گھر میں کما بیٹھا تھا۔ اور یہ مجبوری کی بے کاری انسان کو ہولے ہولے گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔

اندر کا سارا گودا،

اس کی ساری عزت، شرافت، خوش چلنی، اور ایمانداری کو کھا جاتی ہے۔

بس اوپر کا خول رہ جاتا ہے۔

جس کے اندر سے ایک بھیانک خلا جھانکتا ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جو کینسر سے زیادہ خطرناک ہے۔

"اور اس کا باپ صرف سات ہزار روپے میں سودا کرنے کو تیار ہے"۔
اندو نے کسی قدر تحقیر سے کہا۔
"مگر تمہیں کیسے معلوم؟"
اس نے پھر پوچھا۔
رنجیت نے کہا
"جن دنوں مجھے تمہارے گھر آنے کی اجازت تھی۔ میں اکثر اُسے راستے میں دیکھا کرتا تھا۔ اس کا گھر تمہارے سے پہلے پڑتا ہے تارا ستے میں"۔
"مگر تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا!"
اندو نے کسی اندرونی حسد سے جھلس کر کہا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ رنجیت کے ہاتھ سے نکال لینا چاہا۔
مگر رنجیت نے اپنی گرفت زیادہ مضبوط کر دی۔
"اس میں بتانے کی کونسی ایسی بات تھی"!
"اس نے تم سے کبھی کوئی بات کی"؟
"نہیں!"
"تم اس کے جھونپڑے میں کبھی گئے"؟
"کبھی نہیں!"
"قسم کھاؤ"!
"جس کی قسم چاہو کھلا دو"!
اندو چپ ہو گئی۔ چند لمحے غصے میں کھولتی رہی۔
پھر یکایک اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

"اگر تم اس سے ملے بھی ہو گے، تو مجھے کیا؟ تم نے میری خاطر اسے بھی چھوڑ دیا!"

بات کی تہہ تک پہنچنے کا طریقہ عورت کا بالکل اپنا ہوتا ہے۔ مرد کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے ذہنی سفر کرتا ہے۔

عورت ایک حیاتی سفر کرتی ہے۔

مرد کا فیصلہ خارجی اعتبار سے زیادہ صحیح ہوتا ہے، عورت کا نفسیاتی اعتبار سے!

رانی بالا کے مقابلہ میں دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ بالآخر بخیت نے جب اندو کے حق میں فیصلہ کیا تھا تو رانی سے جذباتی طور پر الجھے بغیر اپنی رانی سے عشق کرنے سے پہلے ہی اس نے ذہنی اعتبار سے اسے رد کر دیا تھا۔

اندو بخیت کا مزاج سمجھتے ہوئے یہ بات سوچ رہی تھی کہ بالآخر بخیت اس کی طرف کھنچا چلا آئے گا۔ مگر اس کا یہ خیال غلط تھا کہ بخیت نے کبھی رانی سے عشق کیا ہوگا۔ مگر اتنا غلط بھی نہیں تھا کیونکہ مستقبل ہی میں بخیت کے دل میں وہ لالچ آیا تو تھا۔

بعد میں۔

اندو سے ملنے کے بعد اُسے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ کیونکہ اندو کے حسن میں فطری شائستگی اور حیا کے باوجود ایک غیر ہندوستانی اجنبیت کی بھی جو اسے زیادہ پرکشش بنا رہی تھی۔

اس کے بھورے بال!

سبز آنکھیں!!

اور یونانی خدوخال ـــــ اس غریب جھونپڑے میں کہاں سے پیدا

ہو گئے؟

اس کی ماں کتنی بائی سانولے رنگ کی ایک غریب گھرانن تھی۔ اس کا شوہر ناسک میں ایک معمولی درزی تھا۔

جب اندو ایک سال کی تھی تو اس کا باپ مر گیا تھا۔ اندو کو اپنا باپ بالکل یاد نہیں تھا۔ اسے نام تک بھی یاد نہیں تھا۔

جب سے اس نے آنکھ کھولی اس نے اپنے آپ کو کبھی کی جھگیوں، کھولیوں، کچالوں اور جھونپڑیوں ہی میں دیکھا۔ اس نے اپنے باپ کے حسن، وجاہت اور جوانی کے قصے چرچے سنے تھے۔ صرف اپنی ماں کی زبان سے سنے تھے۔

ممکن ہے اس کی سبز آنکھیں، بھورے بال اور جلد کی زیتونی رنگت، اس کے باپ سے آئی ہو!

کیونکہ اس کی ماں تو کالی آنکھوں، کالے بالوں اور سانولے رنگ کی عورت تھی جو جوانی میں جوان ضرور رہی ہو گی!

اور کسی قدر دل کش بھی!!

حالانکہ بہت سے ننگے لوگوں کی بستی میں جیسا عالم جوانی میں بھی بہت سی عورتوں پر جوانی نہیں آتی!! اور ان کے بدن سے وہ کشش کی حد تک سوندھی خوشبو بھی نہیں آتی!!!

کیونکہ کوئی بھی عورت غریب کی جوانی سے زیادہ دل کش اور دلربا نہیں ہوتی!

اندو نے فخر سے کہا۔

"میں تو سات جماعتیں پڑھ چکی ہوں۔ اور وہ دوسری سے اوپر نہیں

گئی۔ مگر سیٹھ اس کے گھر بھی جاتا ہے۔ ہمارے گھر بھی آتا ہے۔ وہ میری ماں سے کہتا ہے کہ رانی تو اسے سات ہزار میں مل رہی ہے اور وہ میرے لئے دس ہزار تک دینے کو تیار ہے۔"

"تمہاری ماں کیا پندرہ ہزار مانگتی ہے؟"

رنجیت نے پوچھا۔

اندو یکایک بھڑک کر بولی۔

"میری ماں کیا مانگتی ہے، تمہیں اس سے کیا؟ تم یہ بتاؤ، تم نے کیا ترکیب سوچی ہے؟"

ہر بار یہیں پر آکر تان ٹوٹ جاتی تھی۔

آخر وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟ ستر روپے میں دونوں کیسے رہ سکتے تھے؟ زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے، اگر شادی کر لیتے! ہر بار اس مسئلے پر غور کر کے دونوں چپ ہو جاتے۔

گھٹ کر رہ جاتے۔

دنیا سے منہ موڑ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگتے۔

جیسے اس کے گہرے پانیوں میں اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہے ہوں۔

سمندر سے گھبرا کر اندو افق کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔

وہ کہتی۔

"آخر تم کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟!"

"دو تین جگہ کوشش کر چکا ہوں۔" رنجیت جواب دیتا۔ "کوئی گیراج

اسّی روپیہ سے زیادہ مجھے دینے کو تیار نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی میرا کام کچا ہے۔ اور اسّی روپیہ میں ہم دونوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔"

"ہاں۔ وہ تو نہیں ہو سکتا۔ تو پھر تمہارا کام اچھا کب ہوگا؟"

"ڈیڑھ۔ دو سال تو ضرور لگیں گے۔"

"اتنی دیر تک میری ماں انتظار نہیں کرے گی!"

"تمہاری ماں نہیں کرے گی لیکن تم تو انتظار کرو گی؟"

"تو دو سال سے اوپر کیا کر رہی ہوں؟ مگر کب تک ٹالتی جاؤں اُسے؟"

"تم اس بڈھے کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

"میری جوتی جانا چاہتی ہے۔"

"پھر؟"

پھر وہ کیا بتائے اپنے پریم کو؟ جس نے اس کا دل جیت لیا تھا کہ مگن بھائی، گو بڈھا، منحوس اور خبیث تھا۔ مگر ایک مشاق جادوگر کی طرح وہ اندو کے سامنے بڑے سہانے خواب بُن دیتا تھا۔

جس کی رنگا رنگ بوقلموں کیفیت سے اندو کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ وہ ہفت رنگ شبنمی پردوں کی طرح نرم و نازک خواب، اندو کی آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگتے۔

بادامی رنگ کی نئی گاڑی!

پیڈر روڈ پر ایک نیا فلیٹ!!

نائیلان شفان کی ساڑیاں زیب تن، ہر طرف ریشمی پردے جھولتے ہوئے، رنگا رنگ روشنیاں جھلملاتی ہوئی۔

خوابوں کے ہنڈولے میں ایک شہزادی ڈولتی ہوئی۔

چند لمحوں کے لئے!
چند ساعتوں کے لئے!!
چند گھنٹوں کے لئے!!!
اس بڈھے کی باتوں کا رنگین سحر اندو کے سر پر سوار رہتا پھر یکایک ایک لعاب دار کیڑا اس کے جسم پر رینگنے لگتا اور وہ بڈھے مگن کے بدصورت ہونٹوں کا تصور کرتے ہی اس خواب کو جھٹک دیتی۔
"نہیں۔ نہیں!"
"نہیں۔ نہیں!"
مگر کب تک نہیں۔
رنجیت نے دل میں سوچا: انیس برس کی لڑکی کے آخر کچھ اپنے بھی خواب ہوتے ہیں۔ پھر ایک ایسی لڑکی جو خود ایک خواب کی طرح حسین ہو! اس کے خواب تو ——؟
میرے لئے یہ خواب اس قدر اہمیت نہیں رکھتے!
رنجیت نے سوچا۔
میرے باپ کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی بھی ہے۔ وہ خود ہر روز گاڑیاں مرمت کرتا ہے۔ اس کے دل میں اب گاڑیوں کے لئے ویسی کشش نہیں ہے۔
پردے اس کے گھر کے کمروں میں بھی لٹکے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ہے! بہت عمدہ نہیں ہیں، مگر ہیں تو ——!
وہ ایک متوسط طبقے کے گھرانے کا فرد ہے۔ جس نے آج تک احتیاج اور مفلسی کی صورت نہیں دیکھی

شاید اس کے لئے وہ لالچ زیادہ نہ ہو۔
وہ خواب اس کے لئے اتنے رنگین نہ ہوں۔
کہ وہ ان کے پس پردہ اس بھیانک خلا کو نہ دیکھ سکے، جو اندو کی زندگی میں اس وقت پیدا ہو گیا۔ جب گن بھائی اس کے حسن کو گھن کی طرح کھا کے اس کے خون کو جھگیوں اور جھونپڑیوں کے کوڑے کرکٹ میں واپس پھینک دیگا۔
مگر اندو؟
کیا اندو اتنی دور دیکھ سکتی ہے؟
اس نے دل ہی دل میں اپنے سخت گیر باپ کو ایک گالی دی، جو کسی طرح اندو کی شادی اپنے بیٹے سے اس لئے کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ اندو کے باپ کا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کون تھا؟
[illegible] نے بتایا تھا، اس نام کا درزی ناسک میں اس جگہ پر کبھی نہ رہا تھا۔
نہ ہی کبھی اس کی کوئی دوکان رہی تھی۔
نہ ہی کمتی بائی کبھی ناسک میں رہی تھی۔
کچھ لوگوں کے خیال میں اندو کسی انگریز ملازم کی بیٹی تھی۔ یا کسی دوسرے یوروپین افسر کی!
"وہ حرامن ہے حرامن!!
تمہاری اندو ـــــ جسے تم بہو بنا کر میرے گھر میں لانا چاہتے ہو"
بھاسکر زور سے اپنے بیٹے پر چیخا تھا۔
اور ـــــ
معاملہ ختم ہو گیا تھا۔

رنجیت کو معلوم تھا کہ اب اس کا باپ زندگی میں اس مسئلے پر دوبارہ غور کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوگا۔

پھر بھی وہ اندو کی محبت سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ ولدیت کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ رنجیت نے اس مسئلے پر اندو سے بات کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔

انتظار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

مگر انتظار بھی کب تک؟

کبھی کبھی رنجیت اندو کو خاموش دیکھ کر محسوس کرتا جیسے اندو اُس کے ہاتھوں سے پھسلے جا رہی ہے۔ اس وقت بھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔

رنجیت نے سوالیہ نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔

اندو کے سینے میں جذبات کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کا سینہ شدت جذبات سے زیر و زبر ہو رہا تھا۔ اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے وہ آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

"تم مجھے بیس برس انتظار کرانا چاہتے ہو؟ ہو سکتا ہے جب تم بیس برس کے بعد میرے پاس آؤ، میں کسی دوسرے کی ....."

وہ رونے لگی۔

دھیرے دھیرے خاموشی سے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

رنجیت نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ مگر یہ ایک عارضی سہارا تھا۔ اس کی مشکل کا حل نہیں تھا۔

پھر بھی وقتی جذبات کی آنچ میں اس کے ہاتھ اندو کی کمر کو ٹٹولنے لگے۔

اندو دھیرے دھیرے اپنے آنسو بھولنے لگی۔
اس کی کمر میں تھرتھریاں جاگنے لگیں۔
ٹوٹتی ہوئی انگلیاں کچھ مانگنے لگیں۔
وہی آنکھیں جو چند لمحے پہلے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں۔ اب کسی
اندرونی نشہ سے سرشار ہو کر مخمور انداز میں اپنے چاہنے والے کی طرف دیکھنے
لگیں۔ سینہ اوپر اور نیچے، نیچے اور اوپر ہونے لگا۔
سانس رکنے اور چلنے، چلنے اور رکنے لگی۔
جیسے جذبات کا لاوا پھٹ پڑے گا۔
اندو نے گھبرا کر رنجیت کا ہاتھ اپنی کمر سے ہٹا دیا اور سامنے سمندر
میں دیکھنے لگی۔
"ارے وہ کیا ہے" اندو زور سے چیخی۔
"کہاں؟"
رنجیت نے پوچھا۔
سمندر کی طرف ہاتھ اٹھا کر اندو نے انگلی سے اشارہ کیا۔
سامنے سمندر کی لہروں پر ایک بوتل ڈگمگتی، لڑکھڑاتی، تیرتی، لپکتی سمندر
کی لہروں پر چلی آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے ساحل کی طرف!
رنجیت نے مذاق سے کہا۔
"ممکن ہے اس بوتل میں تمہارے خوابوں کے شہزادے کا خط ہو!"
"چھی!" اندو نفرت سے بولی "میرے خوابوں کے شہزادے تم ہو،
صرف تم!!"
"پھر کیا ہے اس کے اندر؟" رنجیت نے پوچھا۔

"تمہارے لئے شادی کا پیغام ہے!"
اندو نے شرارت سے کہا۔
"کس کی طرف سے؟"
"تمہاری رانی بالا نے بھیجا ہوگا، میں کیا جانوں؟"
وہ تنک کر بولی۔
وہ بوتل لہروں کے دوش پر سوار سیدھی ان کی طرف آرہی تھی، وہ دونوں گہرے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔
رنجیت بولا۔
"مجھے تو بیئر کی بوتل معلوم ہوتی ہے۔"
"نہیں اس میں ہیرے ہیں!" اندو بولی۔ "سونے کی ہیریں!"
"سونے کی ہیریں ہوتیں تو بوتل ڈوب گئی ہوتی۔"
"تو ہیرے ہوں گے۔"
اندو کی تخیل کو پر لگ گئے۔
ہیرے! رنجیت سوچنے لگا، سچ مچ اگر ہیرے مل جائیں تو...
.....تو..... پلک جھپکتے میں ان کی ساری مصیبتیں دور ہو جائیں مگر ایسی قسمت کہاں؟
پھر اگر مل جائیں تو سچ مچ!
خوابوں کے رنگین تانے بانے رنجیت کی نگاہوں میں کھلنے لگے۔
اندو نے اُسے کہنی مار کر کہا۔
"ارے کیا سوچنے لگے؟ دیکھتے نہیں ہو بوتل ہم سے دور چلی جا رہی ہے پکڑو اُسے!"

رنجیت دیوار سے چھلانگ مار کر نیچے پتھروں پر آ گیا۔ پھر اُن پر پھلانگتا ہوا وہ نیچے پانی میں اتر گیا۔

اوپر سے اندو چیخی۔

"میں کہے دیتی ہوں اس بوتل سے جو ملے گا، وہ میرا ہوگا ——"

"ہاں۔ ہاں۔ تمہارا ہوگا۔"

رنجیت پانی میں گھستے ہوئے بولا۔

اندو بھی اوپر سے چھلانگ لگا کر نیچے کے پتھروں پر آ رہی۔ پھر دوڑتے ہوئے رنجیت کے پاس پہنچ گئی۔ جو اب بوتل کو ہاتھوں میں پکڑ کر واپس چلا آ رہا تھا۔

اس کی پتلون گھٹنوں تک پانی میں بھیگ چکی تھی۔

بوتل کی لمبی گردن میں قریباً دو انچ کا لمبا کارک پھنسا ہوا تھا۔ بوتل کے اندر کچھ نہیں تھا۔

صرف ایک کاغذی دستاویز تڑی مڑی ہوئی بوتل میں گھسی پڑی تھی!

ہیروں کو غائب ہوتے دیکھ کر اندو کی آنکھوں سے بھی حیرت اور خوشی کی چمک غائب ہو گئی۔

وہ بجھے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"ہوگا کسی نامعقول کا خط!"

"یا کسی خودکشی کرنے والے کی آخری آرزو!!"

"پھر بھی کھول کر تو دیکھو۔" اندو کے اندر عورت کی ٹوہ لینے والی خصلت مچلنے لگی۔

مگر کارک بڑی مضبوطی سے ٹھنسا ہوا تھا۔ اور اسی کارک کی وجہ

سے اب تک پانی کا ایک قطرہ بوتل کے اندر نہ گیا تھا۔
رنجیت نے پتھر سے بوتل کا منہ توڑ دینے کی ٹھانی۔
"ایسا نہ کرو!"
محتاط اندو بولی۔
"پھر کیا کریں؟"
رنجیت نے پوچھا۔
اندو نے اپنے سر کے بالوں سے ایک لمبا ڈبل پن نکال کر رنجیت کو دیا۔
"اس سے کھول کر دیکھو!"
دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد رنجیت بند بوتل سے کارک نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔
کارک نکالنے کے بعد اس نے بوتل کو اٹھا کر کے اِدھر اُدھر سے ہلا کے، وہ کاغذی دستاویز نکال لی۔ پھر اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اندو کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا۔
"حاضر ہے!!"
اس کا لہجہ خاصہ طنزیہ تھا۔
"پڑھو اسے۔ بتاؤ کیا لکھا ہے؟!" اندو نے سنجیدہ ہو کر کہا۔
"نہیں ملکۂ عالم!" رنجیت پھر اسی فلمی انداز سے کہنے لگا۔ "یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ ہی اسے ملاحظہ فرمائیں تو بہتر ہو گا!"
اندو نے دستاویز ہاتھ میں لے لی۔
اس کی تہیں احتیاط سے کھولیں۔ پھر دستاویز کو غور سے دیکھا۔

کئی سال پرانا سٹامپ پیپر تھا۔ تحریر انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تھی۔ لکھا تھا:

—— جن صاحب کو یہ دستاویز ملے، وہ اسے لے کر میسرز کرسٹ بی اینڈ کمپنی سالسٹرز۔ 137۔ کیمبل ہاؤس، کمبالا ہل بمبئی سے ملاقات کریں۔ دستاویز لانے والے کو میری ایک کروڑ کی جائیداد کا وارث قرار دیا جائیگا۔ ——

دستخط

(سر) بومن جی بہرام جی فتنگیر

سب سے آخر میں عدالت کی تصدیق بھی موجود تھی۔

"ایک کروڑ روپے!!" اندو زور سے چیخی!

پھر لڑکھڑائی۔

پھر چکرا کر رنجیت کی باہنوں میں گری اور بے ہوش ہو گئی۔ رنجیت نے ایک ہاتھ سے اندو کو تھاما دوسرے ہاتھ سے دستاویز کو اندو کی انگلیوں سے نکال کر غور سے پڑھا۔

پھر اس دستاویز کے حروف اچھل اچھل کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور چند لمحوں کے لئے زمین آسمان ہنڈولے کی طرح گھوم گئے۔

کیمبل ہاؤس کا طرز کا گھر تھا۔ پرانا اور مضبوط۔ سنگِ مرمر کی چار سیڑھیاں چڑھ کے، جب اندو اور رجنیت ساگوان کے بھاری بھرکم پرانے دروازوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے تو اندو نے گھبرا کر کہا۔

"چلو لوٹ چلیں!"

رجنیت نے کہا۔

"یہاں تک آ گئے ہیں تو اب لوٹ چلنے کی کیا تک ہے؟"

اندو نے بند دروازے کے باہر لٹکے ہوئے پیتل کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے کنڈوں کو دیکھا۔ بولی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے!"

رجنیت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اندو رجنیت کی طرف دیکھ کر ایک پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ اور بولی۔

"مجھے تو مذاق لگتا ہے!"

"مذاق ہوگا تو پتہ معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تک آکر لوٹ جانا، کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

اتنا کہہ کر رنجیت نے گھنٹی بجا دی۔

"میں کہتی ہوں واپس چلے چلو!"

گھبرا کر اندو پلٹنے لگی۔ مگر رنجیت نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ اتنے میں ایک چپراسی نے دروازہ اندر سے کھولا۔

اسے دیکھ کر رنجیت نے سوال کیا۔

"ایسز کرسٹ اجی اینڈ کمپنی ہا!"

چپراسی نے اثبات میں سر ہلا کر دروازہ ان دونوں کے لئے کھول دیا۔ پھر وہ انہیں ایک لمبی غلام گردش میں سے گذار کر ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہو گیا۔

لکڑی کی پرانی چھت کو، جو بیس ستون پر سہارا دیئے ہوئے تھے، چاروں طرف چھت تک دیواروں کی کالک، تاریخ، خانوں میں فائلیں پڑی ہوئی تھیں۔ سیاہ قد آدم الماریوں میں قانونی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ پانچ چھ بابو اور ادھیڑ عمر کے آدمی، سر جھکائے، موٹی فائلیں الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

بائیں طرف بڑی بڑی فرنچ کھڑکیوں سے روشنی آ رہی تھی اور دائیں طرف چند کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن کے باہر لکڑی کے نیم پردے لگے تھے اور چار چھوٹے، جن پر مختلف عمروں کے لوگ اپنے چہروں پر مختلف مدارج کی ذہنی پریشانی، عیاری، مکاری کے اثرات لئے ہوئے، مختلف فائلیں اور کاغذ ہاتھ میں اندر بلائے جانے کے منتظر تھے۔

عمر، ذات، مذہب اور خاندان کے فرق کے باوجود ان سب کے

چہرے ایک سے کیوں نظر آتے ہیں؟
شائد سوچنے کا طریقہ!
یا کام کرنے کا طریقہ!!
یا پیشے کی ہم آہنگی!!!
بہت سے مختلف چہروں کے موم کو بدل کر ان میں یکسانیت پیدا کر دیتی ہے۔

چپراسی نے رنجیت سے پوچھا۔
"کس سے ملنا ہے؟"
"بڑے سیٹھ سے۔"
چپراسی نے گھور کر رنجیت کو گھور کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے مسکرا کر بولا۔

"بڑے سیٹھ کو مرے ہوئے نو سال گذر گئے!"
"تو چھوٹے سیٹھ سے مل لیں گے۔" رنجیت نے کامل دل جمعی سے کہا:

"کام کیا ہے؟"
چپراسی کی آواز میں حقارت کا شائبہ سا تھا۔
رنجیت نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔
"ان کو بول دو سیٹھ بومن جی کے وارث آئے ہیں۔"
"سیٹھ بومن کے!!" چپراسی حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا اور پھر کچھ کہے بغیر مڑا اور سیدھے سب سے آخری کونے کے کیبن میں چلا گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد جو رنجیت کو بے حد طویل معلوم ہوا، اس کیبن میں سے ایک مقبول صورت نوجوان اپنے گھنگھریالے بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالے، آنکھوں پر سنہری رنگ کا چشمہ چڑھائے، مسکراتا ہوا چپراسی کے ساتھ کیبن سے نکلا۔ اور ان دونوں کی طرف حیرت اور استعجاب سے دیکھتا ہوا قریب آیا۔

چپراسی نے کہا۔

"یہ چھوٹے سیٹھ ہیں۔ تم ان سے بات کر سکتے ہو۔"

"میرا نام کارس جی کرسٹ جی ہے۔" اس نوجوان آدمی نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "بولو کیا کام ہے؟"

رنجیت نے کچھ کہے سنے بغیر وہ دستاویز اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پتلون کی جیب میں تھا۔

جس میں اس نے ایک چاقو کو زور سے پکڑ رکھا تھا۔ مبادا کوئی دستاویز کو لے کر بھاگنے کی کوشش کرے تو وہ چاقو کے ایک ہی وار سے اُسے زخمی کر کے وہیں گرا دے۔

جی ہاں!

وہ بمبئی کا رہنے والا تھا۔ یہیں پلا اور بڑھا تھا۔

کارس جی کرسٹ جی نے دستاویز دیکھ کر چند لمحوں تک ان دونوں کو غور سے دیکھا۔

پھر انہیں اپنے کیبن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"میرے ساتھ اس کیبن میں چلئے وہیں بات ہو گی۔"

وہ ان دونوں کو اسی وقت اپنے کیبن میں لے گیا۔ انہیں اپنے سامنے

دو کرسیوں پر بٹھا کر بولا۔

"یہ دستاویز آپ کو کب ملی؟"

"کل!"

رنجیت اور اندو دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔

کارس جی نے مسکرا کر کہا۔

"آپ دونوں میں سے اس دستاویز کا مالک کون ہے یعنی یہ دستاویز کس کو ملی ہے؟"

دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

پھر اندو نے کہا۔

"اِن کو!"

"نہیں!!" رنجیت نے اندو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اِن کو!"

"بوتل تو تم ہی سمندر سے نکال کر لائے تھے!"

اندو بولی۔

"لیکن اس پر نظر تو پہلے تمہاری پڑی تھی!"

"بوتل سے دستاویز تو تم نے نکالی تھی!"

"لیکن پڑھی تو تم نے سب سے پہلے تھی!"

کارس جی کے نوجوان چہرہ پر ایک شگفتہ گلابی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ وکیل کی بجائے کسی فلم کا ہیرو معلوم ہوتا تھا۔

"بہتر ہوگا کہ مجھ سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کسی ایک فیصلے پر پہنچ جائیں۔ میں اتنے میں ایک ٹیلیفون کر کے آتا ہوں!"

اتنا کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ اور ساتھ والی کیبن میں بیٹھ کر تیز

تیز چلنے والی انگلیوں سے ٹیلیفون کا نمبر ملانے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد ——

جب وہ اپنی کیبن میں واپس آیا۔ تو دونوں چپ بیٹھے تھے۔ اندو کا چہرہ شرم سے لال تھا۔ اور آنکھیں حیا سے جھکی ہوئی۔

رنجیت نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"جناب! اُس بوتل ..... میرا مطلب ہے، جس بوتل میں دستاویز ملی، اس کی واحد مالک یہ لڑکی ہے!"

"کیا یہ ٹھیک ہے؟"

کارس جی نے اندو سے پوچھا۔

اندو نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

کرسٹ جی بولا۔

"ہاں یا نا بولو، سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔"

"ہاں ——!"

اندو نے نرم لہجہ میں کہا۔ اور ہاں کہتے وقت پیار بھری ترچھی نگاہوں سے رنجیت کی طرف دیکھ لیا

"کیا دستاویز ٹھیک ہے؟!"

رنجیت نے بے چینی سے پوچھا۔

نوجوان سالسٹر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اندو سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔

"تمہارا نام؟"

"اندو!"

"پورا نام؟"

"اندومتی!"

"شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں!"

اندو نے جواب دیا۔ اور رنجیت کو کچھ ایسا لگا۔ جیسے یہ جواب سُن کر سالسٹر کے لہجے میں کچھ تبدیلی سی آ چلی ہے۔

"عمر؟"

"انیس سال!"

"کہاں رہتی ہو؟"

"جہانگشتی پُل کے پاس، دھوبی لین کی جھونپڑیوں میں!"

سالسٹر نے سب نوٹ کر لیا۔ اتنے میں رنجیت سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے پھر وہی سوال دُہرایا۔

"صاحب! یہ شامپ پیپر پر جو لکھا ہے، وہ ٹھیک لکھا ہے؟!"

کارس جی کرسٹ جی نے اس کی طرف دیکھ کر بڑی رُکھائی سے کہا۔

"جس کو کاغذ ملا ہے اس کو سوال کرنے دو!"

"اچھا ــــ تو ــــ کہو ــــ بتاؤ نا!"

اندو مضطرب ہو اٹھی۔

اب یہ لمحہ کارس جی کرسٹ جی کے لئے بے حد اہم تھا۔ اُس نے نوٹ بک بند کی۔ پنسل کو واپس میز پر رکھا۔ چشمے کو ناک کے بانسے سے ہٹا کر جیب سے رومال نکال کر چشمے کو صاف کیا۔

رومال کو واپس جیب میں رکھا۔

چشمے کو واپس آنکھوں پر چڑھایا۔
پھر گہری مضبوط آواز میں بولا۔
"ہاں۔ لکھا تو ٹھیک ہے!"
ہاں لکھا تو ٹھیک ہے۔ ہاں لکھا تو ٹھیک ہے!
ہاں۔ لکھا تو ٹھیک ہے .....
ہاں لکھا تو ٹھیک ہے ..... ہاں لکھا تو ٹھیک ہے!!
کیبن میں یہ الفاظ بار بار دائروں کی صورت میں پھیل پھیل کر بڑے سے بڑے ہوتے گئے اور چڑیاں کھا کھا کر، آوازوں کے گھومتے ہوئے بھنور بن بن کر، اندو اور رنجیت کے کانوں میں گونجتے گئے۔
اور چند لمحوں تک!
ان دونوں کے کانوں میں ان لفظوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر سالسٹر کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔
"مگر ——"
اور یکایک ساری آوازیں پھٹ کر دھڑام سے فرش پر جا گریں۔ پھر کیبن میں ایک گہری اور خوفناک خاموشی چھا گئی۔
اب وہ دونوں گویا ٹھٹھر اور سمٹ کر اس نوجوان سالسٹر کی طرف دیکھ رہے تھے، جس نے "مگر" کہہ کر گویا ان کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔
اب کارس جی ایک باکمال جادوگر کی طرح ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں گویا ہپناٹزم کے اثر سے مسحور ہو کر اس کی طرف متوجہ تھے۔

"مگر یہ وصیت آج سے اٹھارہ برس پہلے لکھی گئی تھی۔ جب سر بومن جی ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کر ایسی حالت کو پہنچ گئے تھے جب ان کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ چوں کہ ان دنوں اُن کا آگے پیچھے کوئی والی وارث نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ عجیب و غریب وصیت لکھ کر، اسے ایک بوتل میں بند کر کے سمندر میں ڈلوا دیا تھا۔ لیکن اس وصیت کے لکھنے کے چند ماہ بعد وہ حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گئے۔ اور ابھی تک زندہ ہیں اور اپنی جائیداد پر قابض ہیں!"

"تو یہ وصیت گویا"۔ رنجیت بولنے لگا۔

کہ سالسبٹر نے انگلی اٹھا کر اُسے چُپ کر دیا۔

"سولہ سال تک سر بومن جی نے اپنے بوتل والے وارث کا انتظار کیا۔ جب کوئی نہ آیا تو وہ مایوس ہو گئے اور انہوں نے پہلی وصیت کینسل کر کے ایک نئی وصیت لکھ دی۔

لیکن گذشتہ دو تین سال میں کئی بار وصیت کر کے اسے کینسل کر چکے ہیں۔ کیونکہ جب تک جائیداد کا اصلی مالک زندہ ہے۔ اسے اپنی وصیت مرنے سے پہلے ہر وقت تبدیل کر دینے کا حق ہے!"

یہ سن کر اندو اور رنجیت دونوں کے چہرے اتر گئے۔ اور جب سالسبٹر نے دیکھا کہ ان دونوں کے چہرے اچھی طرح اتر گئے ہیں، تو اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے ابھی سر بومن جی کو ٹیلیفون کیا تھا۔ وہ بوتل والی وصیت مل جانے سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں"۔ سالسبٹر نے اندو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اِندو گھبرا کر بولی۔

"جب وصیت کینسل ہو چکی ہے تو ملنے سے کیا فائدہ ؟!"

سالسٹر نے کہا۔

"سر بومن جی کی عمر اس وقت بیاسی برس کی ہے۔ ان کا شمار بمبئی کے چند گنے چنے کروڑ پتیوں میں ہوتا ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو ملنے کا وقت دیتے ہیں۔ آپ خوش قسمت ہیں۔"

اتنا کہہ کر سالسٹر رک گیا۔

"ملاقات کرنے میں کیا ہرج ہے ؟"

رنجیت نے اندو کو مشورہ دیا۔

"ہو سکتا ہے۔" سالسٹر نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہیں انعام دیں یا پھر سے اپنی پرانی وصیت پر عمل کرنے کا فیصلہ صادر فرمائیں۔ وہ بہت عجیب آدمی ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں!"

ذرے توقف کے بعد سالسٹر نے مزید کہا۔

"گاڑی باہر تیار کھڑی ہے!"

اندو اور رنجیت اٹھ کھڑے ہوئے۔

تین

بیاسی ۸۲ برس کا سروہن بے حد شگفتہ مزاج بڈھا ثابت ہوا۔
اس کے حسن سلوک میں اس درجہ برابری اور رواداری تھی۔ جو بہت زیادہ دولت ہونے یا بالکل نہ ہونے کی صورت میں پائی جاتی ہے۔

درمیانے قد کا موٹا آدمی تھا۔

ہنستا ہوا چہرہ، مسکراتی ہوئی آنکھیں، آگے بڑھا ہوا پیٹ۔

اُس نے اِس وقت ایک خوش نما پتلون پہن رکھی تھی۔ جس کے گھیس شانوں تک چڑھے ہوئے تھے۔ کھلے کالروں میں اس کے سینے کے سفید بال نظر آ رہے تھے۔ اونچی پیشانی کے اوپر چند یا صاف تھی صرف کنپٹیوں پر سفید بالوں کے گچھے باقی رہ گئے تھے۔

وہ رنجیت اور اندو کو دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ اس نے پہلے رنجیت سے ہاتھ ملایا۔

پھر آگے بڑھ کر بڑی شفقت سے اس نے اندو کو اپنی باہوں میں لے

لیا۔ اور اس کی بلائیں لینے لگا۔

"ہاں۔ تو تم ہو میری وارث!"

اندو اس حسنِ سلوک سے شرما گئی۔ اس کے گلاب ایسے گال شہابی ہوتے گئے۔

"بڑا خوبصورت نام ہے تمہارا ـــــ اندو ـــــ اتنا چھوٹا۔ اتنا میٹھا!" سریومن ہنس کر بولا "اور تم رہتی کہاں ہو؟"

سالیسٹر بول اٹھا۔

"مہالکشمی کے پاس: ایک سلم ایریا میں۔"

"ہا..... ہا..... سلم ایریا میں!! مجھے ہمیشہ سے شبہ تھا کہ اب خوبصورتی نے فورٹ ایریا، کف پیریڈ اور کولابہ میں جنم لینا بند کر دیا ہے۔ اب بمبئی کی خوبصورت ترین عورتیں، صرف بمبئی کے سلم ایریا میں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے کیچڑ سے کنول پیدا ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کر سریومن زور زور سے ہنسنے لگا۔

اندو اور بھی شرما گئی۔

سریومن نے اندو کو اپنے آپ سے الگ کر کے، اپنی باہوں کو اندو کے شانوں پر رکھ کر اس سے ذرا زور سے کہا۔

"کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟ میرا مطلب ہے، میری بیٹی بن کر!"

اندو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میری ماں ہے!"

"اسے یہاں بلائیں گے۔ اور تمہارا باپ؟"

"وہ مر چکا ہے!"

"تب تو بہت ہی اچھا ہے!" سر بومن بے اختیار بول پڑا۔ پھر جلدی سے اپنا لہجہ بدل کر کہنے لگا "میرا مطلب ہے کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہارا باپ مر چکا ہے۔ مگر ایک طرح سے یہ امر ہماری مصیبت کو کم کرتا ہے اب میں واقعی تم سے ایک باپ کا سا سلوک کر سکتا ہوں۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کوئی قریبی رشتہ دار بھی زندہ نہیں ہے۔

بس تمہیں ہی میری دیکھ بھال کرنی پڑے گی۔

ہا.... ہا... کیسی پلی پلائی خوب صورت بیٹی مل گئی ہے مجھکو! مجھے یقین ہے کہ کارس جی! اگر میں خود سے کوشش کرتا تو بھی ایسی خوب صورت بیٹی پیدا نہیں کر سکتا تھا!"

وہ زور زور سے قہقہہ لگانے لگا۔

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

"یہ!" رنجیت کی طرف اشارہ کر کے "یہ کون ہے؟"

سالسٹر بولا۔

"اس کا نام رنجیت ہے۔"

"اچھا! یہی وہ لڑکا ہے۔ جس نے بوتل کو سمندر سے نکالنے میں اندو کی مدد کی؟"

"جی ہاں!"

"اسے ایک ہزار روپیہ دے کر رخصت کر دو.... نہیں، دو ہزار روپیہ دے دو۔ اس نے اندو کی مدد کی ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ کیا کرتے ہو رنجیت؟"

"میرے باپ کا ایک گیراج ہے، ریس کورس کے پاس۔ بھاسکر گیراج۔ میں اس میں کام سیکھتا ہوں۔ موٹر میکینک کا۔"

"گاڑی چلا لیتے ہو؟"

"جی ہاں!"

"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ مجھے اُمید ہے تم بہت اچھے موٹر میکینک بنو گے۔ کارس جی! اس لڑکے کے گیراج کا پتہ نوٹ کر لو۔ کبھی کبھی اپنی گاڑیاں وہاں مرمت کے لئے جا سکتی ہیں۔ ایں؟"

"جی بہت اچھا۔"

"آؤ بیٹی!" بڈھا بومن جی اِندو کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں جانے لگا۔ "ہم لوگ لنچ کریں گے۔ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ تمہیں بھی لگ رہی ہے نا؟"

مگر ——

اِندو بڈھے بومن جی کے ساتھ چلتے چلتے پیچھے مُڑ مُڑ کر رنجیت کو دیکھتی جا رہی تھی۔

بومن جی اندو کو دوسرے کمرے میں لیجاتے ہوئے بولے۔

"پیچھے مُڑ مُڑ کر کیا دیکھتی ہو۔ وہ، تمہاری مدد کرنے والا نوجوان اچھا خاصہ انعام پا چکا ہے۔ اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا گیا ہے۔ جس کا وہ مستحق تھا، اس سے کہیں زیادہ! —— لو ہم آ گئے کھانے کے کمرہ میں!!"

اندو کے دماغ میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔

واقعات اس سرعت رفتاری سے تبدیل ہو رہے تھے کہ وہ اپنے خیالات کو نمبر وار الگ الگ کر کے سوچ نہیں سکتی تھی۔

سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

چلتے وقت وہ رنجیت سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔ نہ رنجیت اس سے ـــــ اور جوان لوگوں نے آنکھوں سے کہا تھا، وہ اتنا تشنہ، اتنا نامکمل،

اتنا ادھورا تھا کہ اس سے ذہن اور بھی مضطرب ہو چلا تھا۔ وہ تو یہ بھی سوچ نہیں سکتی کہ جو ہو رہا ہے۔ وہ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے!

مگر یہ بڈھا خواب تو نہیں ہو سکتا؟

سامنے کفنا پیریڈ کا سمندر تھا۔

کھانے کے ہال کی ایک طرف کی دیوار جو سمندر کے سامنے تھی، کانچ کی بنی ہوئی تھی۔ جس میں گلاس کے محراب دار دروازے اور جالیاں تھیں۔ اور ان محرابوں اور جالیوں میں رنگین کانچ کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ اور کانچ کے بڑے بڑے دروازوں کے بڑے بڑے پٹ بلوریں نرتکیوں کے ناچتے ہوئے جسموں سے مزین تھے۔

جیسے وہ نرتکیاں جھاگ کی بنی ہوئی ہوں۔ ایسے شفاف اُن کے کانچ کے بدن تھے۔

شفاف دیواروں سے پرے سمندر تھا۔ اور میرین ڈرائیو کا نیم دائرے میں پھیلا ہوا بند۔

نظر دور تک جاتی تھی۔ ساحل کے آخری کنارے تک، جہاں بمبئی کا راج بھون سبز پیڑوں میں گھرا ہوا مستور ہے۔

اندو نے ڈائننگ ہال میں آتے آتے اپنی ران میں چٹکی بھری لیکن اُسے درد محسوس نہ ہوا، اُس سے اُسے گمان گذرا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے۔

مگر یہ بڑھا خواب نہیں ہے۔
کف پیریڈ کا سمندر،
یہ کمرے کی چھت سے لٹکتے ہوئے بلوریں فانوس،
یہ دودھیا چادر میز پر بچھی ہوئی، اور چاندی کے قابوں میں پیش کیا
جانے والا کھانا،
چھری، کانٹے، چمچے، مؤدب بیرے، خادمائیں بے آواز قدموں سے
اس کے قریب میز پر احترام سے جھک کر طرح طرح کے کھانے پیش کرتی ہیں۔
ہے بھگوان یہ کیسا خواب ہے؟!
مگر یہ خواب تو نہیں!!!
بوڑھے بومن جی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔
"تم نے ہاتھ سے کھانا کھا سکتی ہو، اندو؟"
پھر اس نے کھانے کی نگرانی کرنے والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت
سے کہا۔ جو اندو کو بڑی پُر وقار اور خوبصورت معلوم ہوئی۔
"ایلس! اب ہمیں اندو کے لئے ایک گورنس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"
ایلس نے مودب انداز میں اثبات میں سر جھکا دیا۔
"تم کہاں تک پڑھی ہو؟"
سر بومن جی نے اندو سے پوچھا۔
"سات جماعت تک!"
"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ شروع کرنے کے لئے یہ بہت کافی
ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی کے لئے سکالر ہونا ضروری نہیں ہے۔
لیکن کھانے کے آداب!

لیکن محفل کے آداب !! لیکن گفتگو کرنے کے آداب !!!
لیکن طنز و مزاح کے آداب !
لباس پہننے اور اس میں ذاتی اختراع پیدا کرنے کے آداب،
لیکن ناکرنا اور ناکوہاں میں بدل دینے کے آداب !!
ہنسنے اور مسکرانے، دل لینے دل توڑنے، سگریٹ پینے سگریٹ نہ پینے، شراب آفر کرنے، ہنس کر مجروح کرنے، اور مجروح کر کے نرم نرم ہاتھوں سے مرہم رکھنے کے آداب !!

اور ـــــ مردوں کی دنیا میں رہنے کے لئے خوب صورت، خوش پوشاکی! کامیاب حسین عورتوں کو بہت سے دیسی ہتھیاروں سے لیس ہونا پڑتا ہے۔

ہاہاہا۔ اس زعفرانی چکن کے تکے چکھ کر دیکھو۔ یہ ہمارے باورچی کی خاص ڈش ہے۔"

"مگر میں مانس نہیں کھاتی!"

"مانس نہیں کھاتیں اور شراب بھی نہیں پیتیں؟!"

"نہیں!"

"ہاہاہا!" سر بومن زور سے ہنسا "مجھے معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ ایک گجراتی لڑکی .... اور وہ بھی ..... مگر ....." وہ رک کر بولا "کوئی بات نہیں۔ دھیرے دھیرے سب سیکھ جاؤ گی۔ میری بیٹی، اونچی سوسائٹی میں رہنے کے لئے سب آداب سیکھ جائے گی۔

تمہاری ماں کا کیا نام ہے؟"

"کمتی بائی"

"اِتی بائی؟"

"جی نہیں کمی بائی!"

"اوہ۔ امی بائی۔ یقیناً امی بائی ہے تمہاری ماں۔ لنچ کے بعد ہم اسے لیکر یہاں آئیں گے۔ اس نے یقیناً امی بائی پر بہت بڑا داؤ جیتا ہے!

امی بائی ـــــ

یہ نام دینے کا بہت شوق ہے۔ لنچ کے بعد ہم تمہاری ماں اور اس کے سارے سامان کو یہاں لے کر آئیں گے۔

وہ بوتل کہاں ہے جس میں تمہیں یہ دستاویز ملی تھی؟"

اندو نے اپنی کھانے کی کرسی کے نیچے اپنا جھولا نما بڑا پرس رکھ دیا تھا۔ اس میں سے وہ بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

"یہ رہی!"

بوڑھے سر بومن جی کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے چمکنے لگیں۔ وہ بار بار بوتل کو اُلٹ پلٹ کر اوپر نیچے چاروں طرف سے دیکھ رہا تھا۔

بوتل کے پیندے پر کچھ پڑھ کر اُسے گہرا اطمینان ہو گیا۔

"بالکل وہی بوتل ہے۔ وہی بوتل ہے۔ جرمن مسوسل وائن نمبر 1165 اس بوتل کے پیندے پر درج ہے۔ میں نے خود وائن کی اس خالی بوتل میں یہ دستاویز رکھی تھی۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے.... جب تم.... تم.... صرف ایک سال کی تھیں یا دو سال کی یا....."

بڈھا بومن رک گیا اور اندو کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں ایک سال کی تھی!"

اندو نے اسے بتایا۔

سر بومن جی نے خالی بوتل ـــــ ہرے رنگ کی لمبی خالی بوتل کو

کھانے کی میز پر رکھ کر، سب بیروں اور خادماؤں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہی وہ دو کروڑ کی بوتل ہے۔ جو آج سے اٹھارہ سال پہلے میں نے
سمندر میں پھینک دی تھی۔"
"مگر وصیت میں تو صرف ایک کروڑ درج ہے!"
اندو نے ٹوکا۔
"ہاہاہا" بومن جی زور سے ہنسا۔ "اٹھارہ سال پہلے میری جائیداد کی
مالیت ایک کروڑ روپیہ تھی۔
اب خود بخود دو کروڑ ہو چکی ہے۔
حالانکہ پچھلے ڈیڑھ دو سال سے میں نے کوئی کام نہیں کیا، کوئی بزنس
نہیں کیا۔ گھر بیٹھ کر کھایا ہے۔ مگر روپیہ کی یہی تو خاصیت ہے، مسز اندو متی!
کہ ایک خاص مقدار اور تعداد کے بعد روپیہ خود بخود بڑھتا ہے۔
چند سو صرف مصیبت ہیں،
چند ہزار صرف افلاس ہیں،
چند لاکھ محض ناکافی ہیں،
ہاں — تیس چالیس لاکھ کے اوپر، دولت خود بخود بڑھنے لگتی ہے۔
"ہمیں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بس کرسی پر بیٹھے رہو۔ اور اس دولت کو خود بخود
ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح بڑھتے ہوئے دیکھتے جاؤ۔ ہاہاہا...."
سیٹھ بومن جی رک گیا۔
پھر اس ہری بوتل کو میز پر سجا کر اور سب کو مخاطب کر کے بڑے
ڈرامائی انداز میں بولا۔
"سنو! یہ دو کروڑ کی بوتل ہے، جو اس لڑکی کے ہاتھ آئی ہے۔

آج سے یہ لڑکی میری دو کروڑ کی جائیداد کی واحد وارث ہوگی۔"

یکایک ہال کے ایک کونے سے چاندی کے ایک قاب کے گرنے کی آواز زور سے آئی۔ اور اندو اور بومن جی اور دوسرے بیروں اور خادماؤں نے پلٹ کے دیکھا۔

الیس کے ہاتھ سے چاندی کا قاب فرش پر گر چکا تھا۔ اور وہ جھک کر اُسے اٹھا رہی تھی۔

اس کا سفید چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔

چار

اتنا لذیذ اور مزے دار کھانا اس نے آج تک نہیں کھایا تھا۔
کھانا کھانے کے بعد اندو اور بومن جی دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ جہاں
ان کو چھوٹے چھوٹے پیالوں میں کافی پیش کی گئی۔
اندو کو صوفہ پر بیٹھے بیٹھے نیند سی آنے لگی۔
گھر پر تو وہ ٹاٹ بچھا کر فرش پر سوتی تھی۔ مگر یہ صوفہ اسے سو
کی دعوت دے رہا تھا۔ جانے کس شے کا بنا ہوا تھا کہ اس کے ذرا بھی ہلنے
جلنے پر جھولے کا سا مزا دیتا تھا۔
اُسے اونگھ سی آنے لگی۔
بومن جی اس سے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور
کے نشہ میں غلطاں ـــ اُوں، آں ـــ کر کے جواب دے رہی تھی۔ پھر
نے یہ جواب دینا بھی ترک کر دیا۔
اب نیند اس پر پورا غلبہ کر چکی تھی۔ اور وہ وہیں صوفہ سے

لگائے نیم دراز حالت میں سو گئی۔

معلوم نہیں کب تک سوتی رہی؟!

یکایک کسی آہٹ پر چونک کر اٹھی۔ تو دو خادمائیں، ڈرائنگ روم کی بتیاں اور فانوس روشن کر رہی تھیں۔ شائد یہ سوچ گرانے کا کھٹکا ہوا تھا۔

جب وہ جاگی تو اس نے اپنے جسم کے گرد ایک نرم گرم ریشمی لحاف کو لپٹے پایا۔ اسے نیند میں ڈوبے دیکھ کر بومن جی نے یہ لحاف اس کے گرد خود اڑھا دیا تھا۔ اور تاکید کر دی تھی کہ جب تک اندو سونا چاہے اسے سونے دیا جائے۔ اور اب شام ہو گئی تھی۔ اندو جاگ گئی تھی۔

ایک خادمہ نے سر بومن جی کو اندو کے جاگنے کی اطلاع دی۔ بومن جی نے آکر بڑے پیار اور شفقت سے اندو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور کہنے لگے۔

"اب جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ! تمہاری ماں پریشان ہو رہی ہو گی اسے لے کر آئیں گے نا!"

ایک خادمہ اندو کو لے کر باتھ روم میں گئی۔

اس نے اندو کو باتھ استعمال کرنے کی پیچیدہ ترکیب سمجھائی۔ ماڈرن طرز کا باتھ روم شہری زندگی کا لازمہ ہے۔ ورنہ ذاتی جسمانی صفائی ناممکن ہے۔

ورنہ آدمی قدرت کے قریب رہے۔

پرانے زمانے کے شہر چھوٹے ہوتے تھے۔ قریب میں جنگل اور ندی نالے ہوتے تھے۔ اس لئے عام گھروں میں باتھ روم کے تصور بھی نہ تھے۔ کیونکہ ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن ماڈرن شہروں کی وسعت اور پیچیدہ زندگی نے جنگلوں کو انسانوں

سے بہت دور کر دیا ہے۔ اور باتھ روم کی ضرورت زیادہ سے زیادہ اہم ہوتی جاتی ہے مگر جس سلم ایریا میں اندور رہتی تھی وہاں اس قسم کے باتھ روم کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔

منہ پر دو چھپکے مارے،
ساڑی کی شکنیں درست کیں،
بالوں کو کس کر پیچھے کی طرف موڑ کر جوڑا باندھا ـــــ اور تیار!
مگر اس تیاری کے باوجود سارے جسم میں ایک بڑھتی ہوئی غلاظت کا احساس رہتا ہے۔

جب پانی پینے کے لئے ہی کم ملے اور پچاس جھگیوں میں ایک نل ہو تو پرسنل ہائی جین کیا معنی رکھتی ہے؟

پرانے زمانے کے قصبوں اور شہروں میں ہر ایک کے لئے صاف ستھرا رہنا ممکن تھا۔ آج کل کے بڑے شہروں میں غریبوں کے لئے ممکن نہیں۔ اور جیسا باتھ روم اندو اس وقت استعمال کر رہی تھی ایسا باتھ روم تو اس نے صرف فلموں میں دیکھا تھا۔

فلموں نے بڑا غضب ڈھایا ہے۔
امیروں کے گھر، انکے کمرے، ان کی شان و شوکت، ان کے لباس، ان کی دعوتیں، ان کے باتھ روم، ان کا سامان تعیش، دکھا کر جس طرح غریبوں کو للچایا ہے۔ ایسا کسی سوشلسٹ پارٹی سے بھی ممکن نہ ہوا ہوگا۔

فلمیں!
اور خاص طور پر تفریحی فلمیں!! ـــــ جماعتی جنگ کا سب سے بڑا حربہ ثابت ہو رہی ہیں۔ بلاواسطہ اور نادانستہ طور پر سربومن جی کے خیال میں مشکل

سامنت، سلودھ مکرجی اور بھپی سونی ـــــ جارج فرنانڈس سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

ٹب کا نیم گرم گنگنا پانی رنجیت کی باہوں کی طرح اس کے گرد لپٹا جا رہا تھا۔ اندو کو پھر نیند سی آنے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو ٹب سے باہر نکالنے پر تیار کیا۔ اور خوشبوؤں سے رچے ہوئے بڑے بڑے تولیوں سے اپنے جسم کو پونچھا۔

اور پھر ـــــ وہی بلاؤز اور سکرٹ پہن لیا۔ جو کل تک اس قدر حسین اور جاذب نظر تھا۔ اور آج کسی طرح آنکھوں میں جچتا ہی نہ تھا۔

تیار ہو کے وہ سربومن جی کے پاس ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ اچھے اور عمدہ غسل نے اندو کے حسن کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ مگر وہ لباس اب اس پر جچ نہیں رہا تھا۔

سربومن نے تنقیدی نگاہوں سے اندو کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اور اس پر اس نے کچھ ذہنی فیصلے کئے۔

مگر اس وقت اس نے اندو سے کچھ نہ کہا۔ کیوں کہ وہ اپنی ماں سے ملنے کے لئے بیتاب تھی۔

اور اس کے بعد رنجیت سے!

کل وہ سربومن جی سے ضرور رنجیت کے بارے میں بات چیت کریگی۔ ایک دفعہ میں ایک ہی مسئلہ طے ہو سکتا ہے نا۔

نوجوان وکیل کارس جی کرسٹ جی بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس نے بھی گہری نگاہوں سے اندو کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ اور اپنی جگہ کچھ ذہنی فیصلے کئے تھے۔ اور ـــــ یہ بہت اچھا ہے کہ فطرت نے انسانی

دماغ کو ایک مضبوط کھوپڑی کے اندر چھپایا ہے، جہاں سے اس کا اندرونی عمل دکھائی نہیں دیتا۔

فرض کر لو کہ انسان کی کھوپڑی کانچ کی بنی ہوتی اور اس پر کوئی طریقہ ایسا ایجاد ہو گیا ہوتا کہ جس میں ہر انسانی خیال اور عمل کی ذہنی تصویر ٹیلی وژن کی طرح دکھائی دے جاتی تو انسان کی سماجی زندگی ناممکن ہو جاتی۔

فرض کر لو ایک ڈرائنگ روم میں ایک آدمی ہاتھ میں جام لئے تم سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے اور تم اپنے پرائیویٹ جیبی ٹیلی وژن کی مدد سے یہ دیکھ رہے ہو کہ اندر ہی اندر وہ تم سے اس قدر جلا بیٹھا ہے کہ تمہیں قتل کر دینا چاہتا ہے۔ تو ——

ایک طرح سے تو یہ اچھا ہوتا کہ تم خبردار ہو جاتے مگر سماجی زندگی بالکل ناممکن ہو جاتی!

کیوں کہ ہم میں سے ہر شخص نفرت کرتا ہے اور اکثر اور عموماً کرتا ہے۔ —— محبت تو بہت ہی نادر شے ہے۔ اور کبھی کبھی ہمارے آس پاس کی گدلی فضا میں دھنک کی طرح یا اندر کے حسن کی طرح دکھائی دیجاتی ہے۔

"چلئیں!!"

سر بومن جی نے بڑے پیار سے اندو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اندو نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک شاندار کیڈی لک میں تینوں بیٹھ کر چلے۔

اندو کو راستہ دینے کے لئے سر بومن جی اور کرسٹ جی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ وردی پوش ڈرائیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ پیچھے سر بومن اور اندو

بیٹھ گئے۔

آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ کارس جی کرسٹ جی بیٹھ گیا۔

جب اندو رنجیت کو لے کر کارس جی کرسٹ جی سے ملنے گئی تھی تو کرسٹ جی اُسے اس وقت ایک بہت بڑے حاکم کی طرح دکھائی دیا تھا جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت تھی۔

اب ——

وہ ایک حقیر سا ملازم دکھائی دے رہا تھا جس کی سیٹ ڈرائیور کے ساتھ تھی۔

حالاں کہ چند لاکھ تو اس کے پاس بھی ہوں گے۔ مگر چند لاکھ کی دو کروڑ کے سامنے کیا حیثیت ہے؟

اندو نے اپنے آپ کو کرسٹ جی سے بلند اور ارفع محسوس کیا اور ساتھ ہی ساتھ اندو نے یہ بھی محسوس کیا کہ انسانی فطرت کتنی جلدی اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ خصوصاً جب کہ حالات اچھے ہوں۔

صرف نیچے جاتے ہوئے انسان کشمکش کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے گراوٹ پسند نہیں ہے!

لیکن رفعت کا احساس اسے بہت پسند ہے!!

اس وقت کیڈی لک میں بیٹھ کر اندو کو کچھ اس طرح کا احساس ہو رہا تھا جیسا اُسے کئی بار ہینگنگ گارڈن کی اونچائیوں سے نیچے بمبئی کی عمارتوں کو دیکھنے سے ہوا تھا۔ اُس وقت اسے سارا شہر اپنے قدموں تلے دکھائی دیا تھا۔

کچھ ایسی ہی ملتی جلتی حالت اس وقت اُس کے دل کی تھی۔ پھر یکایک اُس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس کے آتے ہی اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اور دل گھبرانے سا لگا۔

"کہیں یہ لوگ مجھے واپس اسی جھونپڑ پٹی میں چھوڑ دینے کے لئے تو نہیں جا رہے ہیں"۔

طرح طرح کے حیلے بہانوں سے،

دلائل سے،

وہ پورا راستہ اپنے آپ کو سمجھاتی رہی۔ مگر یہ شک بار بار سر اٹھاتا رہا۔ ——

اندور راستہ بتاتی رہی۔

کیوں کہ کرسٹ جی، ڈرائیور، پوسن جی کسی کو اس سلم ایریا کا راستہ ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔

اتنا معلوم ہوتا تھا دور سے دیکھنے پر، مہالکشمی سے گذرنے پر، کہ یہاں وہاں، جہاں جھونپڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بچی چھتیں، اور ٹاٹ کی اوریاں لٹکی ہوئی، اور عورتیں لڑتی ہوئی، ننگ دھڑنگ بچے شور مچاتے ہوئے اور چوہے کے بلوں کی طرح سوراخ نما دروازے دور سے نظر آتے ہیں۔

وہ کوئی سلم ایریا ہی ہوگا۔

مگر نہ ڈرائیور وہاں رہتا تھا۔ اور نہ کرسٹ جی کا کوئی گاہک، اور سر پوسن کا کوئی دوست اور شناسا —— ہر آدمی اپنے سرکل میں گھومتا ہے۔ اپنے بنک بیلنس کے مطابق!

سماج میں تہ در تہ چھوٹے بڑے دائرے ہیں۔ بڑے بڑے دائرے نیچے ہیں، جن میں لاکھوں انسان سما جاتے ہیں۔ جوں جوں انسان اوپر اٹھتا جاتا ہے، یہ دائرے تنگ ہو جاتے ہیں

نچلے دائروں میں چند ہزار سما پاتے ہیں۔

اور پھر چند سو سب سے اوپر کے آخری دائرے میں گنے چنے دس بیس افراد رہ جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ سماج کی چوٹی پر رہتے ہیں، جہاں ہوا تازہ اور کھلی ہے۔ آکسیجن کا افراط ملتی ہے۔ دھوپ کی فراوانی ہے اور پھولوں کی خوشبو! ایک وسیع دل کش منظر چاروں طرف پھیلا ہوا اور سامنے سمندر لہریں لیتا ہوا۔

مگر ہر چھوٹا دائرہ اپنے سے بڑے نچلے دائرے کے اوپر کھڑا ہوتا ہے اور نچلا دائرہ اپنے سے بھی بڑے اور نچلے دائرے کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ مگر اتنی اونچائی پر جا کر انسان اپنی بنیاد بھول جاتا ہے۔

جب گاڑی جھونپڑپٹی کے قریب رکی . . . . تو بدبوؤں سے سر بومن جی کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں نہ ایسی بدبوئیں سونگھی تھیں، نہ ایسے جانور نما بچے دیکھے تھے۔ جنہوں نے چلا چلا کر خوشی سے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

اس نے رومال اپنے منہ پر رکھ لیا۔

مگر رومال کی خوشبودار تہوں سے افلاس، نکبت، بیماری اور تنگ دستی کی بدبو اس کے نتھنوں میں چلی آ رہی تھی۔ حالاں کہ سیٹھ جی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ سارا علاقہ جس پر جھگیوں اور جھونپڑیوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بومن کی اپنی ملکیت ہی میں شامل تھا۔ اور ان جھگیوں کا کرایہ

اس کے کارندے وصول کرتے تھے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔
بدصورتی تو بدصورتی ہے۔
اور ذہن اور احساس اور نازک مزاج سربومن اُسے زیادہ دیر تک
برداشت نہیں کر سکا تھا۔
اس لئے اُس نے اندو کو ہدایت دی کہ وہ کارس جی کرسٹ جی اور
ڈیامور کے ساتھ جھونپڑپٹی کے اندر اپنے گھر تک جائے اور اپنی ماں کو ساتھ
لے کر جلدی سے آجائے۔
جیوں ہی اندو جھونپڑپٹی کی لمبی تاریک بدرو نما گلی میں داخل ہوئی۔
بچوں اور لڑکوں نے اسے پہچان کر شور مچانا شروع کر دیا۔ دروازوں پر عورتیں
اپنا اپنا کام چھوڑ کر جمع ہوتی گئیں۔
بچوں کو کمر پر لادے ہوئے یا آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو
پیچھے چھپائے ہوئے۔ بچوں نے یہ خبر ساری جھونپڑپٹی میں یہ پھیلا دی کہ اندو
کسی امیر کے ہمراہ کوئی [illegible] بس گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہے۔ اور جب اندو
اپنے گھر کے باہر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں پہلے سے گھر کے دروازے
پر کھڑی ہے۔ اس کا انتظار کر رہی ہے۔
کمتی بائی کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔
اس نے اندو کو باہوں میں لے کر چٹ چٹ بلائیں لینا شروع کیں۔
اور سب حال پوچھنا چاہا۔ مگر کرسٹ جی نے بیچ میں ٹوک کر جلدی سے کہا۔
"وہ تم کو بعد میں بتا دیا جائے گا۔ ابھی تو تم فوراً اپنی بیٹی کے ساتھ
چلو۔"
"کہاں پر؟"

ماں نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ بھی بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم چلو تو۔" ڈرائیور بولا "باہر سیٹھ جی جلدی میں ہیں۔"

"میں اپنا سامان تو لے لوں۔"

"سامان لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

کرسٹ جی نے ذرا کڑوے لہجہ میں کہا۔

"سیٹھ کی گاڑی میں اس غلاظت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"مگر میری سینے کی مشین!؟"

ماں نے احتجاج کیا۔

"نئی مل جائے گی۔" کرسٹ جی نے اطمینان بھرے لہجے میں وعدہ کیا۔ پھر ڈرائیور سے کہنے لگا۔ "تم اِدھر پیسہ دے کر کسی کو کمتی بائی کے گھر پہ رہنے اور اس کے سامان کی رکھوالی کرنے کے لئے بولو۔ میں اِن لوگوں کو لے کر باہر چلتا ہوں۔"

"جی بہت اچھا۔" کہہ کر ڈرائیور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کرسٹ جی اندو اور اس کی ماں کو لے کر باہر آ گیا۔

اندو نے گاڑی کے قریب پہنچ کر سیٹھ بومن کا تعارف اپنی ماں سے کرایا۔

سیٹھ بومن جی نے صائب جی تو کی مگر اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمتی بائی کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ اندو کسی طرح کمتی بائی کی اولاد نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سوکھی، دُبلی، سانولی، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس!

ہاں! اس کی آنکھوں میں ایک ذہین اور شاطرانہ چمک ضرور تھی۔
اس نے جھک کر سیٹھ کو سلام کیا۔ اور سیٹھ نے اسے جلدی سے ڈرائیور کی سیٹ کے قریب بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

اتنے میں ڈرائیور بھی سب بندوبست کر کے واپس آ گیا اور آتے ہی اس سے کمی بائی نے سوال کیا تو ڈرائیور بولا۔

"جھبرے کو تمہارے گھر کی رکھوالی پر لگا آیا ہوں!"

جھبرے کا نام سن کر کمی بائی ایک دم مطمئن ہو گئی۔ اس نے کمر سے ایک پوٹلی نکال کر اسے کھولا۔ کھول کر ایک زنگ آلود ڈبیہ نکالی۔ ڈبیہ نکال کر اسے کھولا۔ اور کھول کر ایک چٹکی بھر نسوار لے کر اپنے نتھنوں میں سڑک لی۔ بومن جی کے دل میں ایک متلی آمیز کیفیت محسوس ہوئی۔ مگر سر بومن کسی طرح اسے دبانے میں کامیاب ہو گیا۔

کرسٹ جی نے بھی طوعاً کرہاً اس گندی غلیظ عورت کے ساتھ چند منٹ کے لئے بیٹھنا منظور کر لیا۔ اگر اس وقت اس کا موکل سر بومن نہ ہوتا کوئی دوسرا کم حیثیت کا مالک ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتا۔ مگر وہ تو سر بومن کا اپنا سالسٹر تھا۔ اور اس سے پہلے اس کا باپ سر بومن کا سالسٹر تھا۔ وہ لوگ سر بومن کے خاندان کے پروردہ تھے۔ اور ایک طرح سے ان کی کمپنی جو کئی لاکھ روپیہ کی حیثیت کی مالک تھی سر بومن اور اس کے خاندان کا عطیہ تھی۔

اس لئے چند منٹ کی غلاظت برداشت کرنی پڑے گی۔ جس طرح مزدوروں کے ڈیلی گیشن کو مل مالک اپنے شاندار آفس میں چند منٹ کے لئے برداشت کر لیتا ہے۔

حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے جھونپڑپٹی کے سینکڑوں مرد عورتیں

لڑکیاں اور بچے جو کل تک یہیں رہنے والی اندو اور کمی بائی کو اس شاندار گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھ رہے تھے۔ جو اندر سے ایر کنڈیشنڈ تھی۔ اور ایک ہوائی محل کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اور جو اس قدر لمبی معلوم ہوتی تھی کہ جھونپڑ پٹی کی آٹھ جھگیاں ملا کر بھی قطار وار کھڑی کر دی جائیں تو چھوٹی پڑیں۔

رشک اور حسد سے جل کر رانی بالا خاک ہو گئی۔ مگر اس نے اپنے رشک اور حسد کو چھپاتے ہوئے ایک طنز بھرا قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔ مگر جھونپڑ پٹی میں رہنے والوں کی حیرت اس قدر زیادہ تھی اور گاڑی اس قدر خوبصورت تھی اور سیٹھ اتنا امیر دکھائی دیتا تھا۔ اور اب تو ڈرائیور سے اس کا نام بھی بہت سے لوگوں نے سن لیا تھا۔ اور مچھیرے نے یہاں تک بتا دیا تھا کہ اس پوری جھونپڑ پٹی کا دراصل وہی مالک تھا۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کسی کو رانی بالا کے کھوکھلے قہقہے میں اپنی ہنسی ملانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کا قہقہہ ایک بے بضاعت گونج میں دب کر رہ گیا۔ اور جب گاڑی چلی گئی تو کئی لوگ اندو کی خوش قسمتی کو، کمی بائی کی شاطرانہ افتاد پر محمول کر رہے تھے۔

کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ بیٹی ماں سے بھی زیادہ ہوشیار نکلی ہے۔

کچھ لوگ محض اسے وقتی خوش قسمتی پر محمول کر رہے تھے۔ صرف رانی بالا کی ماں نے گھر آ کر اپنی بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھا۔ ایک اندو ہے، ایک تو ہے۔ جو ہر وقت نچلے درجے کے ڈرائیوروں، موٹر میکینکوں، اور بنگلوں میں کام کرنے والے باورچیوں کے سنگ گھومتی پھرتی ہے۔ اور ایک اندو ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو نے، حرام زادی....."

اتنا کہہ کر رانی بالا کی ماں بھیکا بائی نے اپنی بیٹی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا

مگر رانی بالا لچک کر پلٹ گئی۔ اور پھر اپنے سینے کی نوکیں نیزے کی اَنی کی طرح اٹھائے جھونپڑپٹی کے باہر ناریل کے ایک بڑے چھپر میں مختلف ساز و سامان سے بھری ہوئی کیرلا سے آئے ہوئے پستہ قد شبٹی کی دوکان میں گھس کر کہنے لگی۔

"حمام صابن کی ایک ٹکیہ دو۔ سر دھونا ہے۔"

"پیسے لائی ہو؟"

رانی بالا نے لاپرواہی سے جلدی سے اپنا مُنہ آگے کر دیا۔ شبٹی نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اور دوکان پر کسی گاہک کو نہ پا کر رانی بالا کے ہونٹ چوم لئے۔

پھر جلدی سے رانی بالا نے اُسے دھکا دے کر اپنے سے الگ کر دیا۔ جب شبٹی ہاتھ بڑھا کر لکڑی کے طاق سے حمام کی ٹکیہ اٹھا رہا تھا تو اس بوسے کے کرنٹ سے ابھی تک اس کا سارا جسم نانبے کی تار کی طرح جھنجھنا رہا تھا۔

رانی بالا صابن کی ٹکیہ لے کر جھومتی ہوئی دوکان سے باہر نکل گئی۔ اسے دیکھ کر سڑک پر سے گزرتے ہوئے سترہ نمبر بنگلے کے باورچی نے سیٹی بجائی۔ رانی بالا نے زبان نکال کر اس کا مُنہ چڑا دیا۔

"میٹنی شو دیکھے گی؟"

باورچی نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اُسے دکھایا۔

"اپنی ماں کو لے جا۔"

رانی بالا بڑے تیکھے لہجہ میں بولی۔ اور ناگن ایسی چوٹی کو فضا میں لہرا کر گھوم گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایسا خمار رہتا تھا، جیسے اس نے نوٹانک پی رکھی ہو۔ اس نشہ کے عالم میں وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پر آج اِندو نے اسے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے جھونپڑی کے باہر رکھی لکڑی کے ایک شکستہ جنگلے کا سہارا لیا اور ایک پاؤں اٹھا لیا اور اس کے ٹخنے پر لپٹے ہوئے بچھوے کو بجانے لگی اور سوچنے لگی کہ کیوں اندر ہی اندر اس کا سارا بدن تھرکتا رہتا ہے؟

ہائے یہ میرا بدن مجھے چین لینے دے تو میں کچھ سوچوں!!

رانی بالا لکڑی کے جنگلے سے ٹیک لگائے ہوئے یہی سوچتی رہی بھجوا سے چاندی کا راگ سنتا رہا۔

چند گز کے فاصلے پر بھاسکر گیراج کے باہر سنکیسر کے پیڑ کے نیچے رنجیت رنجیدہ و ملول کھویا ہوا کھڑا تھا۔

گاڑی کب کی نکل گئی تھی اور اب ہنگنگ کارڈن کی بل کھاتی ہوئی اونچائیوں سے گذر رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا ہارن چاندی کے راگ کی طرح بج اٹھتا تھا۔

بائیں طرف بچوں کے پارک میں پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ اور پودے گویا باہیں پھیلا پھیلا کر انہیں ہیلو کہتے ہوئے گذر گئے۔

"یہ امیر لوگ زندہ رہنا جانتے ہیں۔ شاید اب میری بیٹی بھی زندہ رہ سکے گی!"

کمتی بائی نے خوش ہو کر کمر کے کسی دوسرے حصے سے ساڑی کے دبے ہوئے کونے کو پلٹ کر ایک بیڑی نکالی اور اسے منہ میں داتی ہوئی کرسٹ جی سے کہنے لگی۔

"تمہارے پاس ماچس ہوگی۔ میں جلدی میں ماچس بھول آئی ہوں!؟"

کمتی بائی اپنے پیلے پیلے دانتوں سے مسکرا دی۔ کارس جی کو اس کے منہ سے بدبو کا ایک بھبکا سا چھوٹتا نظر آیا۔ جس میں تمباکو ہی نہیں، پیاز اور گلی سڑی بھاجی کے

ریزوں کی بدبو شامل تھی۔ ایسی بدبو جو ایسے مُنہ کی مستقل خاصیت بن جاتی ہے بچپن سے بڑھاپے تک۔ اور پھر لاکھوں کھولیوں اور جھگیوں اور جھونپڑوں میں شب و روز ایسے ہی مُنہ چومے جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ دوسرے منہ بھی اتنے ہی بدبودار ہوتے ہیں۔

اسی لئے کسی کو کسی سے گلا نہیں ہوتا۔

بلکہ عادت سے مجبور ہو کر وہی بدبو محبت کی لطیف مہک بن جاتی ہے۔ اور ایسے ہونٹوں سے حلاوت بھی محسوس ہوتی ہو گی کسی کو۔

کرسٹ جی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے پاس ماچس نہیں ہے۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ کمتی بائی تو اندو کی مار ہے۔ اس لئے اس نے جیب ٹٹول کر لائٹر نکالا۔ اور اسے جلا کر کمتی بائی کے مُنہ کے قریب لے گیا۔

کمتی بائی نے بڑے ٹھاٹ سے لائٹر سے بیڑی سلگائی اور اس کا دھواں ہولے ہولے مُنہ سے نکالنے لگی۔

چاندی کا بچھوا بجاتے بجاتے جب رانی بالا تھک گئی تو اس نے اپنا یہ پاؤں نیچے رکھ دیا۔ پھر اپنے حُسن کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ اور دوسرا پاؤں اٹھا کر جنگلے کی لکڑی پر رکھ کر اسے بجانے لگی۔

اُسے معلوم تھا کہ اس کا سارا بدن ایک تازہ پکے ہوئے سیب کی طرح رس دار ہے۔ پہلی نگاہ میں دیکھ کر کوئی اس کے حُسن کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے لمحے میں چاہے اسے اپنی بیوی کا خیال آئے یا اپنی عزت کا! یا اپنے مرتبہ کا ــــ!! مگر وہ پہلی نگاہ میں کسی ایسے پکے ہوئے پھل کا تصور پیش کرتی تھی جو کسی کی جھولی میں گرنے کے لئے بیتاب ہو۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خود رانی بالا کو اپنے جسم کی بیتابی اور بے صبری

کا شدت سے احساس تھا۔ اور اُسے خود اس پر صبر کر کے اسے قابو میں رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

اب وہ کس کس کو قابو میں کرے ؟
آگے کے جوبن کو
کہ پیچھے کے کولھوں کے گھماؤ کو
کہ اڑتی، مچلتی نگاہوں کو
کہ خود بخود مُنہ سے پھوٹ پڑنے والی ہنسی کو

کبھی کبھی اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ سب اعضاء اس کے جسم کے حصّے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے جسم میں رہنے والی مختلف ہستیاں ہیں۔ اگر وہ ایک پر قابو پاتی ہے تو دوسری بے قابو ہو جاتی ہے۔

وہ ہونٹ بند کر لیتی ہے تو آنکھیں چلنے لگتی ہیں۔
چال دھیمی کرتی ہے تو سینہ ڈولنے لگتا ہے۔
گردن نیچی کر کے جوانی کو قابو میں کرتی ہے تو کولہے بے طرح گھومنے لگتے ہیں۔ ——— ہائے ری ایک جوان عورت کے لئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کتنا مشکل ہے ؟

رنجیت ابھی تک سنیکسر کے پیڑ کے نیچے کھویا کھویا سا کھڑا تھا۔ ہولے ہولے قدموں سے ڈولتی رانی بالا اس کے پاس پہنچی۔ قریب آ کر اس نے بڑی ادا سے ایک انگلی مُنہ میں دبائی، آنکھیں نچا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔

"ہائے بے چارے کو چھوڑ کر چلی گئی ؟!"

رنجیت نے چونک کر دیکھا۔ قریب میں رانی بالا کھڑی تھی۔

"کیا ہے ؟" اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"اندو!" رانی بالا نے بڑی معصومیت سے کہا۔ پھر ہاتھ ہلا کر بولی "چلی گئی!؟"

"تجھ سے کون بات کرتا ہے؟"

رنجیت نے بڑے کرخت لہجے میں اس سے کہا۔

"اے بابو!"

بالا ذرا دیر رک کر بولی۔

"کیا ہے ——؟"

"کیوں مرا جا رہا ہے اس چھنال کے غم میں؟! دُنیا میں اور بھی لڑکیاں ہیں!"

اتنا کہہ کر رانی بالا نے ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھا، سینے کو اُبھار کر ذرا سا ڈولایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر آئی ہوئی اُلجھی لٹ ٹھیک کرتے ہوئے گنگنانے لگی۔

"لٹ اُلجھی بالم —— لٹ اُلجھی بالم!"

رنجیت نے غصّے سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بھاگتی ہے یہاں سے کہ دوں ایک؟"

رانی بالا ہنس کر بھاگ گئی۔ بھاگتے بھاگتے دور تک پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ رنجیت نے سوچا۔

"غضب کا نمک ہے سالی میں! مگر بڑی سستی چھوکری ہے۔ بے پناہ کشش ہے اس کے بدن میں! مگر میں ایسا نہیں..... البتہ اگر یہ رات کے کسی نرم سے اندھیرے میں مل جائے یونہی اچانک! اور اپنے گال میرے گال سے لگا دے تو..... تو اس کی نرم گرم سانسوں کو منع کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

پانچ

بومن لاج کف پریڈ پر تین منزلہ محل نما مکان تھا۔ تیسری منزل کی چھت پر ایک بڑا مغلئی گنبد تھا۔ اور اس کے دونوں طرف دو مینار اور ان کے اوپر دو دو جہت راجپوتی برجیاں، جن میں کھڑے ہو کر آدھا بمبئی نظر آتا تھا۔

مغلئی گنبد کے سامنے کی چھت پر گملوں کی مدد سے ایک خوبصورت باغیچہ ترتیب دیا گیا تھا۔ جسے آج کل کی ماڈرن اصطلاح میں رُوف گارڈن کہتے ہیں۔ مغلئی گنبد کے پس منظر کو لے کر یہ باغیچہ بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

گرمیوں کے دنوں میں یہاں کھلے میں پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ اور فلڈ لائٹ کا بھی انتظام تھا۔ پورے گنبد کو روشنی سے بقعہ نور بنانے کے لئے، بجلی کے قمقموں کی قطاریں، گولیں اور لہریئے زردوزی کے کام کی طرح گنبد پر خاص خاص وضعوں پر بچھا دی جاتیں۔

مگر اس وقت باغیچے میں بہت کم روشنی تھی۔ باریک آہنی جالی کی قدِ آدم دیوار پر رات کی رانی کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان کے پیچھے سے مدھم سی

روشنی رات کی رانی کی خوشبو کے ساتھ مل کر آ رہی تھی، جیسے پھول روشنی دے رہے ہوں! اور پتیوں سے خوشبو اڑ رہی ہو۔

شاید یہ خوشبو کا اثر تھا کہ اندو کو رہ رہ کر رنجیت یاد آ رہا تھا۔ رات کے سوندھے سایوں میں، اس کے جھلکتے ہوئے اندھیروں میں، ہلکی روشنی کی سطح میں، اُسے کبھی یہاں کبھی وہاں رنجیت کھڑا ہوا نظر آتا۔

شکایت کرتا ہوا ایک خاموش مجسمہ!

اور ہر چند سایوں میں، دفعتاً کے دھندلکوں میں گھل جاتا اور اندو کے دل میں ایک درد کی ہلکی سی لکیر چھوڑ جاتا۔

اندو کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سی آہ نکلی۔

سربومن رات کے کھانے کے بعد اندو اور کارس جی کو لے کر اوپر بالیچے میں گھوم رہے تھے۔ رات کی رانی والی جالی کے سامنے۔ حالاں کہ اس بالیچے میں اور بھی حسین اور خوبصورت کونے تھے مگر سربومن کو یہی گوشہ مرغوب تھا۔

سربومن اس وقت بڑی بے چینی سے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹہلتے جاتے تھے۔ ہر لمحہ ان کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

اندو ایک کیومن پام کے سڈول تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اور کارس جی بار بار اپنے چشمے کے شیشوں کو صاف کرتا ہوا اس الجھن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس وقت سربومن کو درپیش تھی لیکن جسے سمجھنے سے وہ اپنے آپ کو قاصر پا رہا تھا۔

یکایک سربومن نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا۔

"میں انسان ہوں!"

اندو کو ہنسی آ گئی۔ مگر اس نے بروقت اپنی ہنسی ضبط کر لی۔ اور منہ پر ہاتھ

رکھ لیا۔

"میں انسانی جذبوں اور رشتوں کو سمجھتا ہوں۔ اور ان کی قدر کرتا ہوں!"

کارس جی کی سمجھ میں اب تک کچھ نہ آیا تھا۔ پھر سربومن اندو کے سامنے رک کر بولے۔

"تم ٹھیک ہو ——— یعنی تمہیں ٹھیک کر لیا جائے گا..... مگر.....؟"

معاملہ اب کچھ کچھ کارس جی کی سمجھ میں آنے لگا۔ اندو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"مگر تمہاری ماں....." سربومن نے اپنے کندھے اُچکائے، دونوں ہاتھ پھیلائے اور گھٹے ہوئے لہجے میں کہا "ناممکن..... ناممکن....."

"کیا ناممکن؟"

"تمہارے ساتھ اس کا رہنا ناممکن ہے۔"

"مگر وہ میری ماں ہے!"

"میں کب کہتا ہوں، وہ تمہاری ماں نہیں ہے۔ حالانکہ لگتی نہیں ہے۔" سربومن جی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ..... وہ ایک قسم کا تمہارا بڈھا ایڈیشن ہو گی۔ مگر وہ تو..... بالکل ہی..... تم سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس کی صحیح جگہ وہی جھونپڑی ہے۔ یہ گھر نہیں ہے۔"

"آپ مجھے میری ماں کو چھوڑنے کے لئے کہہ رہے ہیں!"

"میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن سربومن جی کا گھر ایک شریف مہذب، پرانا گھرانہ ہے۔ بہو کا۔ جس کی اپنی ایک عزت اور شہرت ہے۔ اس کی ایک روایت ہے۔ تم نوجوان ہو اور خوبصورت ہو۔ دلہن بھی لگتی ہو۔ تم پر محنت کی جا سکتی ہے اور محنت کے بعد تمہیں اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ تم میری جائیداد کی صحیح وارث بن سکو۔ اور سربومن کے ساتھ ساری مجلسی سوسائٹی میں گھوم

سکو۔ لیکن تمہاری ماں..... کارس جی کیا تم دو کروڑ کی وارث، بمبئی کی سب سے بڑی امیر لڑکی کی ماں کی حیثیت سے اس عورت کو منظور کر سکتے ہو؟ جسے ہم ابھی جھوپی لین سے اٹھا کر لائے ہیں؟"

"میں اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی!" اندو نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ "جس نے مجھے جنم دیا۔ پالا۔ پوسا۔ جوان کیا۔ اُسے آج میں اپنے اچھے دنوں میں چھوڑ دوں؟"

"چھوڑنے کی بات کون کرتا ہے، اندو!" سر بومن اسے فوراً پچکار کر بولے "میں اُسے سورت بھیج سکتا ہوں یا جہاں اس کا جی چاہے۔ جس شہر میں چاہے، وہ رہ سکتی ہے۔ وہاں اُس کے رہنے سہنے، کھانے پینے، کپڑے لتے، نوکر چاکر کا مکمل بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اُسے پانچ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ دیا جائے گا۔"

"وہ کسی دوسرے شہر میں رہے گی۔" اندو بولی۔ "تو میں اس کو ہر روز دیکھنے کیسے جا سکوں گی؟"

"ہر روز تو ممکن نہ ہو گا اور میں اسے پسند بھی نہیں کروں گا لیکن تیسرے، چوتھے مہینے، سال میں دو تین بار تم اسے جا کر مل سکتی ہو۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو اندو۔ جس طرح کی زندگی میں تمہارے لئے پلان کر رہا ہوں۔ اس میں وہ بیچاری حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ کسی طرح فٹ نہیں ہوتی!"

"پر وہ میری ماں جو ہے!"

اندو پھر وہی رٹ لگانے لگی۔

سر بومن کا چہرہ غصے سے سُرخ ہونے لگا۔

کارس جی نے بڑی نرمی سے کہا۔

"میری ایک اور تجویز ہے۔ اندو کی ماں یہیں اسی گھر میں رہ سکتی ہے!"

"ناممکن!!"

سربومن نے سختی سے سر ہلایا۔

"ذرا میری تجویز تو سُن لیجئے۔ اندو کی ماں اسی گھر میں رہ سکتی ہے۔ مگر ماں بن کر نہیں، نوکرانی بن کر! اندو اور ہم دونوں کے سوائے کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ وہ اندو کی ماں ہے۔ اسے نوکر خانے میں ایک الگ کمرہ دیدیا جائے گا۔ وہاں پر اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی، کھانے پینے اور رہنے کی! پھر وہ اس گھر کی ایک خادمہ ہوگی اور اسے وہی تنخواہ ملے گی جو یہاں ایک خادمہ کو ملتی ہے لیکن اندو سے وہ اندو کی ماں بھی ہوگی۔ اور اس طرح اندو اس سے روز مل سکتی ہے"۔

سربومن یہ تجویز سُن کر مسکرانے لگے۔

"بہت اچھی ترکیب ہے۔ آں۔ بیحد عمدہ۔ اور سنو اندو!" سربومن بچوں کی طرح خوش ہو کر اندو سے کہنے لگا "کبھی کبھی تم بیمار ہو کر یعنی بیماری کا بہانہ کر کے اسے یعنی اپنی ماں کو اپنے کمرہ میں بھی بُلا سکتی ہو۔ اور کیا چاہیئے تمہیں؟ اس طرح تمہاری بات بھی رہ جاتی ہے۔ اور میری بات بھی بن جاتی ہے۔ تم ہر روز اپنی ماں سے مل سکتی ہو! اور میں تمہاری ماں کو اپنی سوسائٹی میں تمہاری ماں کہہ کر پیش کرنے کی ذلت سے بچ جاتا ہوں!" اندو کو تذبذب میں دیکھ کر سربومن جی نے کارس جی سے کہا "میرا خیال ہے اس مسئلے پر تم خود اندو کی ماں سے بات کر لو"۔

کارس جی نیچے چلا گیا۔

سربومن اندو کو لے کر اسے اپنے روف گارڈن کے مختلف گوشے اور کونے دکھانے لگے۔ ہر گوشے اور کونے میں پھولوں اور جھاڑیوں اور گملوں میں اُگنے والے پام کے علاوہ چھنتی ہوئی روشنی کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ خوبصورت رنگین جو بی بیچ

اور سیدھی کرسیاں جگہ جگہ رکھی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے خوش نما میزیں۔

اور ایک کونے میں ایک جاپانی طرز کا چھوٹا سا لکڑی کا پل تھا جس کے دونوں طرف جاپانی لالٹینیں ڈول رہی تھیں اور پل کی محراب کے کنارے کنارے رنگین قمقموں کی لمبی قطار دہری تہری ہو کر پل کے اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی تھی۔ سربومن نے بٹن دبا کر روشنی کر کے اس خوبصورت پل کو دکھایا

"یہ روف گارڈن میں نے مشہور جاپانی باغبان کمتی سوزو کی سے بنوایا ہے۔ پورے بمبئی میں اس ڈھنگ کا کوئی روف گارڈن نہیں ہے۔ اس پل کے نیچے کا ہر پتھر ایک خاص زاویے سے اس چھت پر جڑا گیا ہے اور پل کے نیچے دونوں کناروں کے درمیان یہ جو سوکھی ندی سی نظر آتی ہے اس کے نیچے ایک پتلی فولادی تہہ ہے۔ جس پر کسی خاص دعوت کی رات پانی چلتا ہے۔ اور فوارے چھوٹتے ہیں۔ خصوصاً جب چاند نی رات ہوتی ہے۔ تو اس روف گارڈن کا حسن دیکھنا چاہیے اب تو میں بہت کم دعوتیں کرتا ہوں۔ لیکن اب تم آ گئی ہو تو..... اور وہ جو دور جنگلہ جو تمہیں نظر آتا ہے۔ انگریزی بینڈ کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور وہ مستطیل نما لکڑی کا فرش، اور ناچنے کی جگہ ہے۔ کیا تم بال روم ڈانس جانتی ہو؟"

"کیا؟"

اندو منہ کھول کر بڑے گنوار لہجہ میں بولی۔

سربومن مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ سب تم بہت جلدی جان جاؤ گی۔ لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے اندو کہ میری جائیداد کی وارث تم ہو گی!"

سربومن پیار سے اندو کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

"تم، یعنی ایک لڑکی اگر یہ بوتل کوئی لڑکا لے کر آتا تو میں اُسے اس گھر میں

گھسنے نہ دیتا۔ وہیں کارس جی کے دفتر سے ہزار دو ہزار روپیہ انعام دے کر چلتا کر دیتا اور لڑکی بھی کوئی ٹھیک ٹھاک سی چاہیے تھی جیسی کہ تم ہو ورنہ .....؟"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ اسے بھی انکار تھا۔ وصیت تو میں کینسل کر ہی چکا تھا۔"

"لیکن اگر آپ کی زندگی کے بعد یہ بوتل کسی اور کو ملتی؟!"

"تو بات دوسری تھی۔ میرے مرنے کے بعد کیا ہوتا ـــــ یا ہوگا۔ اس سے مجھے کیا سروکار ہے۔ لیکن دیکھ کر تو مکھی نہیں نگلی جاتی!"

"میری بات مکھی ہے کیا؟"

اندو کو پھر غصہ آنے لگا۔

"وہ میری جائیداد کی وارث بھی نہیں ہے!"

اندو کوئی تیز بات کہنے کو تھی کہ اتنے میں کارس جی آگیا۔

"وہ راضی ہے!"

کارس جی نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا راضی ہے؟"

اندو بھڑک کر بولی۔

"بمبئی سے باہر رہنے کو بھی راضی ہے اور یہاں رہنے پر بھی! بلکہ اُسے بمبئی سے باہر رہنا زیادہ پسند ہے!!"

"نہیں ....نہیں!" اندو فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "وہ یہیں رہے گی.... میرے پاس ـــــ"

"مگر تم....."

سر بومن بولا۔

"ہاں ....ہاں ...." اندو نے غمناک لہجے میں کہا "میں کسی کے سامنے اُسے اپنی ماں نہیں کہوں گی۔ مگر وہ رہے گی یہیں پر.... میرے قریب.... اسی گھر میں!"

"اور کبھی کبھی وہ نیچے نوکر خانے سے اٹھ کر تمہارے کمرہ میں بھی سو سکتی ہے۔" سربومن نے اس کڑوے فیصلے پر مخملیں غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ کبھی کبھی وہ میرے کمرے میں بھی سو جایا کرے گی۔" اندو نے دہراتے ہوئے اپنے آپ سے میکانکی انداز میں کہا۔ کیوں کہ اس نے دل سے اس فیصلے کو منظور نہ کیا تھا۔ "مثال کے طور پر وہ آج میرے ہی کمرہ میں سوئے گی۔"

سربومن جی منع کرنے والا تھا کہ کارس جی نے آنکھ کے اشارے سے سربومن کو منع کر دیا۔

سربومن اس وقتی مصلحت کو سمجھ کر چُپ ہو گئے۔

"ارے حرام خور، سور کی بچی، مُردار!"

رات کی خاموشی اور تنہائی میں کمّی بائی اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"سات جنم تک بھی اگر تو مہالکشمی جی کے مندر میں دیوی کے چرنوں میں سر رگڑتی تو ایسا گھر تجھے کبھی نہ ملتا۔ سالی نخرے دکھاتی ہے یہاں آ کر۔ تیری ماں اگر نیچے نوکر خانے میں رہنے لگے گی تو کون سا تیری ماں کا خصم آ کر لے جائے گا۔ اسے وہاں سے ..... اس مائی ٹلے جھونپڑے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے وہ نوکر خانہ! میں دیکھ کر آئی ہوں۔ وہاں بجلی کا پنکھا ہے۔ بجلی کی روشنی ہے۔ سپرنگ دار لوہے کا پلنگ ہے دیوار میں بال کاڑھنے کے لئے ایک لمبا سا شیشہ بھی لگا ہوا ہے۔ اور ہر دو کمروں پر ایک باتھ روم بھی ہے اور مجھ کو کیا چاہیئے؟!"

پھر وہ اندو کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔
"اور پھر یہ مواسلیٹھ کیا ساری عمر زندہ رہنے والا ہے۔ بیاسی برس کا بڈھا ہے!"
اتنا کہہ کر کمتی بائی زور سے ہنسی۔
رات کے سناٹے میں اندو کو اپنی ماں کی وہ ہنسی بہت کھوکھلی اور بھیانک معلوم ہوئی۔
کسی کی موت کے بارے میں یوں سوچنا ——————؟؟؟

پچھ

بائیس برس پہلے شعلہ رُخ ایلس ہال نے سر بومن کا دل جیت لیا تھا۔ مگر معاملہ دو سال سے زیادہ نہیں چلا۔ کیوں کہ سر بومن بہت جلد عورتوں سے اُکتا جاتا تھا، مگر وہ اس قدر امیر تھا کہ کسی عورت کو خفا نہیں ہونے دیتا تھا۔ تعلقات توڑنے میں بھی شائستگی سے کام لیتا تھا۔ یوں کہ فریقِ مخالف کا دل نہ دُکھے۔

عرصہ بیس سال سے ایلس ہال بومن لاج کی ہاؤس کیپر تھی۔ آنکھیں اس کی آج بھی اچھی تھیں اور جلد پر سنگِ مرمر کا شبہہ ہوتا تھا۔ لیکن ان بیالیس برسوں میں وہ اپنے جسم کو مناسب نہیں رکھ سکی تھی۔ حالاں کہ دل و جان سے اس کی کوشش کیے جاتی تھی۔

وہ اِن ہندوستانی عورتوں کی طرح نہیں تھی جو شادی کے بعد اپنے خاوند کے کندھے پر سر رکھ کر جو پھیلنا شروع کرتی ہے تو اپنی عمر کے پچیسویں برس ہی میں وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں انہیں چالیس برس کے بعد پہنچنا چاہیے۔ اس کے بعد بھی اِن عورتوں کو یہ گلہ رہتا ہے کہ ان کے شوہر ان سے وفادار کیوں نہیں!

"وہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتی، میں اس کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا!"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جہاں تک کھانے کے آداب کا تعلق ہے آٹھ دس روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میک اپ..... میک اپ کا مسئلہ تو رہ ہی گیا۔"

مسز بومن نے بے چینی سے چلاتے ہوئے کہا۔

"مسز مسٹری؟"

"نہیں نہیں۔ مجھے بہترین میک اپ ماہر چاہیئے۔ جلدی سے سوچ کر بتاؤ؟"

"تو مجھے مسز مین ڈال سے پوچھنا پڑے گا۔ مگر..... مگر وہ بہت مہنگی ہے۔ بہت بہت مہنگی!"

الیس بولی۔

"تم مہنگائی کی فکر مت کرو۔"

"کیا ارادے ہیں؟" ایکا ایک الیس بھڑک کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

بڈھے نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

"یونہی پوچھ رہی ہوں!"

"میری عمر بیاسی برس کی ہے!"

"برٹرینڈ رسل نے اس سے زیادہ عمر میں شادی کی تھی۔"

"اس کی عمر انیس کی ہے۔"

"ابھی ایک سولہ سال کی اطالوی لڑکی نے ایک بانوے برس کے بڈھے سے شادی کی ہے۔ کل یہ اخبار میں پڑھا ہے۔"

جاتی تھی اور سر بومن اپنا ڈارک براؤن ریشمی گاؤن کی پٹی اپنی کمر کے گرد ڈھیلے ڈھالے انداز میں کستا ہوا کہہ رہا تھا۔

"اِندو کے لئے بہترین درزی سے بہترین فیشن اور جدید ترین ڈزائن کے لباس سلوائے جائیں!"

"صرف مغربی ڈریس؟"

"نہیں۔ ساڑیاں بھی ہوں گی۔ اور قمیض شلوار کے سوٹ بھی اور مغلئی کرتے غرارے بھی۔ ہر لباس کی ٹرائی کرو۔"

"بہت بہتر!"

"اس کے لئے ایک اچھی سی گورنس دیکھو۔"

الیس کے باریک، ابرو کمان کی طرح اوپر اٹھے، اس نے پنسل کا ایک سرا منہ میں دبا کر کہا۔

"اُم ..... روشن جھبوالا کو بلاؤں؟"

چٹکی بجا کر سر بومن نے کہا: "ویری گڈ!"

"لباس کے لئے LA MODE؟"

"او۔ کے۔"

سر بومن نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔

"اور بال روم ڈانس کے لئے؟"

"وکٹر اوہارا ــــ؟"

"کون ہے یہ؟"

"ابھی دو ماہ ہوئے ہیں امریکہ سے ٹریننگ لے کر لوٹا ہے!"

"عمر کیا ہے؟"

"پچیس برس کے قریب۔"

"نہیں!"

"تو بانی کنٹریکٹر؟"

"وہ کیا ابھی تک زندہ ہے؟"

"اس کی عمر مشکل سے پینسٹھ یا چھیاسٹھ برس کی ہوگی۔"

"وہ بہت بڈھا ہے۔ میں کسی چالیسئے پینتالیسئے کو ترجیح دوں گا۔"

"مجھے دیکھنا پڑے گا۔"

الیس نے سوچ کر کہا۔

"مگر جلدی دیکھو۔ اور سنا ہے آج کل ستارا بھی فلیش میں آرہی ہے۔ اور ہندوستانی گانا اور ناچ بھی، کس قدر....."

سربومن بولتے بولتے رک گیا۔ پھر ایکدم بول اٹھا۔

"اس کی آواز کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔ کل اسے گنگناتے سنا تھا۔ آواز تو اچھی ہے۔"

"تو؟"

"میں گورو آنند سوامی نوڑالکر کو ہندوستانی ناچ کے لئے اور گانے کیلئے گردھر مہاراج کو بک کر لیتی ہوں۔"

"اس کے کھانا کھانے کے طریقے سخت واہیات ہیں۔" سربومن اپنے چہرے پر کراہیت کے آثار نمودار کرتے ہوئے بولا۔

"سلم ایریئے سے اٹھائی ہوئی لڑکی کے بارے میں آپ اور کیا سمجھ سکتے ہیں! ویسے میں نے سوسن کو لگا دیا ہے اس کام پر۔ گذشتہ چار پانچ روز میں ہی کافی فرق پڑ گیا ہے۔"

یا طوطا کرتا وفادار ہیں تو ادھر اُدھر تاک جھانک کیوں کرتے ہیں؟

حالانکہ اینگلو انڈین مس ایلس ہال نے بہت سال تک اپنے جسم کو بیحد تناسب حالت میں رکھا تھا اور اتنے برس گذر جانے کے بعد وہ کہنے کو کنواری ہی تھیں شاید دل کے کسی گوشے میں ابھی تک وہی ایک نوکھر تقرار ہی ہے۔ شاید ہر بشر کے دل میں امید کا کوئی ایسا آتشکدہ ہوتا ہے جو کبھی بجھتا نہیں۔

ایلس کو اس میں شبہہ نہیں سر بومن جی سے ایک غیر معمولی لگاؤ تھا۔ اس کے لئے اُس نے آج تک شادی نہیں کی تھی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ سر بومن جی نے بھی گھر کا سارا انتظام اس کو سونپ دیا تھا۔ مگر وہ اس کی بیوی تو نہ تھی۔ مسٹریس بھی نہیں تھی اب تو رہ حالاں کہ کبھی کبھی اب بھی سال میں چھ ماہ میں اسے سر بومن کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی اجازت مل جاتی تھی۔ مگر سر بومن کی طرف سے یہ محبت کا اظہار نہ تھا محض ملکیت کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر وہ اتنے پر بھی خوش تھی۔ اور یوں صرف اور محض اتنے ہی پر خوش ہو جانا مغربی عورتوں کے مزاج کے خلاف ہے مگر کہیں پر اب بھی اس کی صاف ستھری انگریزی رگوں میں ہندوستانی خون بولتا تھا۔ سہہ جانے والا۔ غم کھانے والا۔

آج سر بومن دیر سے اٹھا تھا۔ اس وقت اُس نے ناشتہ بھی اپنے بیڈ روم میں کیا تھا۔ ایلس نے اپنے ہاتھ سے اسے ناشتہ کرایا تھا۔ اور کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

دن میں ایک دو بار چند منٹ کے لئے ایسی کانفرنس ان دونوں کے درمیان ضرور ہوتی تھی۔ جب گھر کے ضروری مسائل نپٹائے جاتے تھے۔ اور آنے والے دنوں کے لئے سر بومن کی وضع کردہ پالیسی سے متعلق ضروری اشارے اور احکامات وصول کئے جاتے تھے۔ اس وقت ایلس ایک نوٹ بک لے کر پنسل سے نوٹ کرتی

"وہ بڑھا احمق تھا۔"

"سوویت جارجیا میں ایک بڈھا ایک سو ساٹھ برس کا موجود ہے اس کی آخری شادی ایک سو چھ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ سنا ہے اس سے دو بچے بھی ہیں۔"

"نانسنس!" بومن فیصلہ کن لہجے میں چلایا۔

پھر کچھ لمحے خاموش رہ کر اپنے کافی کے پیالے کو گھورتا رہا۔ پھر نگاہ اٹھا کر ایلس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا میں اپنی جائیداد کی وارث میں اتنی دلچسپی بھی نہیں لے سکتا؟"

"سوال یہ ہے کہ ایک مسلم ایریا سے آئی ہوئی لڑکی جائیداد کی وارث بھی کیوں ہو؟"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے، تمہارا نہیں۔ وہ بوتل لے کر آئی ہے تم نہیں۔ اخلاقی طور پر میرا کچھ فرض ہے۔"

"وہ فرض تم اُسے دو لاکھ روپیہ دے کر پورا کر سکتے تھے، دو کروڑ کیوں؟"

"کیا مجھے وارث طے کرنے کا اختیار بھی تمہیں دینا پڑے گا؟"

"نہیں! ایسا میں نے پچھلے بیس برس میں نہیں سوچا، تو آج کیوں سوچوں گی؟!"

ایلس کی آواز میں لرزش آ گئی۔ اس کے چہرے پر دکھ کا غبار سا چھانے لگا۔ سر بومن نے بستر سے اٹھ کر اس کا گال تھپتھپایا۔ قریب تر ہو کر اس کے روٹھے ہوئے چہرے پر پیار کر لیا۔

پھر نرم لہجے میں بولا۔

"مجھے غلط مت سمجھو ایلس!"

"کیا واقعی!؟"

ایلس کے بجھے ہوئے لہجے میں خوشی جھلکنے لگی۔

"ہاں۔ میں اندو کو ایک باپ کی محبت دینا چاہتا ہوں۔ تم نہیں سمجھو گی۔ آج سے چالیس سال پہلے، میری لڑکی گلشن پندرہ برس کی ہو کر مر گئی تھی۔ کوئی بات اس میں ہے جو مجھے اس کی یاد دلاتی ہے۔

حالاں کہ شکل و صورت میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔

تم نہیں سمجھو گی۔ میں بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر کوئی بات ہے جو مجھے اس کی...."

"اس کی آواز؟"

"نہیں۔"

"چلنے کا انداز؟"

الیس نے سوچ سوچ کر کہا۔

"کچھ ہو گا ـــــ!"

پھر رک کر بولی۔

"اس عمر میں سبھی لڑکیاں ایک سی شوخ اور چنچل ہوتی ہیں۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آج سے بیس برس پہلے کی اُسے اپنی جوانی یاد آنے لگی۔ اور اس کے دل میں پھر شبہے اٹھنے لگے۔

اگر آج سے بیس برس پہلے کی الیس تو آج کی انیس برس کی اندو! کیوں نہیں؟ وہ یقیناً اس بڈھے پر نگاہ رکھے گی۔ بڑی کائیاں ہے؟

"کچھ اور؟"

سر بومن نے اس کانفرنس کو اب ختم کرنا چاہا۔

"کچھ نہیں .... ہاں، روزالی کا ٹیلیفون آیا تھا۔ کل بھی، پرسوں بھی!"

روزالی سر بومن کی نئی محبوبہ تھی ـــــ

سر بومن نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کہہ دینا۔ میں کسی کام سے کھنڈالے جا چکا ہوں۔ کچھ اور؟"

"رنجیت کا ٹیلیفون آیا تھا!"

"کون رنجیت؟"

سربومن نے چونک کر پوچھا۔

"وہی لڑکا جو اندو کے ساتھ آیا تھا۔ پچھلے چار دن سے ٹیلیفون کر رہا ہے۔ دو بار کارس جی کے ہاں کیمبل ہاؤس میں اس سے مل چکا ہے۔"

"کیا چاہتا ہے؟ میں اُسے دو ہزار روپیہ دے چکا ہوں۔"

"اس نے دو ہزار نہیں لئے۔ کارس نے مجھے آپ کو بتانے کو کہا تھا۔ میں بتانا بھول گئی!"

"نہیں لئے..... احمق!"

"احمق تو وہ یقیناً نہیں ہے۔"

"تو کیا چاہتا ہے وہ؟"

"وہ اندو سے ملنا چاہتا ہے۔ اور اندو بھی اس سے ملنا چاہتی ہے۔" ایلس نے آخری وار کیا۔

"تم نے کیا کیا اب تک؟"

"اب تک میں نے رنجیت کا ٹیلیفون اندو تک پہنچنے نہیں دیا۔"

"بالکل ٹھیک کیا۔ اُسے کبھی اندو سے ملنے نہ دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی گذشتہ زندگی کا کوئی بشر بھی..... میں اس کی نئی زندگی ایک صاف سلیٹ کی طرح شروع کرنا چاہتا ہوں۔"

"زندگی صاف سلیٹ نہیں ہوتی سربومن!"

"تو پھر وہ کیا ہوتی ہے؟"

"زندگی ایک پھول ہوتی ہے۔ اور مرجھا جاتی ہے۔ زندگی ایک پتھر ہوتی ہے اور گھس جاتی ہے۔ زندگی لوہا ہوتی ہے اور زنگ کھا جاتی ہے۔ زندگی آنسو ہوتی ہے اور گر جاتی ہے۔ زندگی ہمک ہوتی ہے اور بکھر جاتی ہے۔ زندگی سمندر ہوتی ہے جس پر لہر در لہر خراشیں پڑتی رہتی ہیں۔ خراشیں ... سر بومن جیسے کسی نے پانی کو چاقو سے کاٹ دیا ہو....."

ایلس چپ ہو گئی مگر اس کی آنکھوں سے ابھی تک شعلے نکل رہے تھے۔

"یہ میرا حکم ہے کہ رنجیت کو کبھی اندو سے ملنے نہ دیا جائے۔" سر بومن آخر کار بولا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم لوگ بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔"

"تم اندو کو لے کر کھنڈالے چلی جاؤ۔ گورستی اور ڈانس ماسٹر اور دوسرے عملے کے ساتھ۔ ہاں! لوناولہ میں ہمارے منیجر کو ٹیلیفون کر دو، بنگلہ تیار رکھے۔"

"کتنے دن کے لئے؟"

"دس.... پندرہ.... بیس پچیس روز کے لئے.... ایک مہینے کے لئے!"

"اور ایک مہینے کے بعد؟"

"جب تک میں رنجیت کو ہمیشہ کے لئے باہر بھجوا دوں گا۔"

"کتنے دنوں کے لئے؟"

"جتنے دنوں کے لئے بھی ممکن ہو سکا۔ دو ماہ کے لئے۔ چار ماہ کے لئے۔ چھ ماہ کے لئے!"

"اور چھ ماہ کے بعد؟"

"میں اُسے ہندوستان سے باہر بھجوا دوں گا۔"

"فرض کر لو، اُس نے باہر جانا منظور نہ کیا؟"

"اُسے کرنا پڑے گا!"

"فرض کر لو کہ انکار کرتا ہے؟"

سر بومن چپ رہا۔

"وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔"

"پھر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے مان بھی جائے!" سر بومن نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔ "میں نے آج تک ایسا کوئی آدمی یہاں نہیں دیکھا جس نے روپے کے آگے سر نہ جھکایا ہو!"

"اندو کہہ رہی تھی اسے ریس کورس جانا ہے کسی سے ملنے کے لئے۔ ریس کورس کے سامنے ہی رنجیت کے باپ کا گیراج ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ تم اندو کو لے کر۔ اور اس کے لئے سب انتظام مکمل کر کے کل پرسوں ہی کھنڈالے چلی جاؤ! ——— جاؤ اب مجھے تنہا کرنے دو۔"

سر بومن باتھ روم جانے کے لئے مڑ گیا۔

پھر ———

گھوم کر واپس آیا اور ایلس کے گال کو تھپتھپا کر باتھ روم میں غائب ہو گیا۔ ایلس نے کچھ لمحے اس کے لمس کے اڑتے ہوئے جذبے کو اپنی انگلی سے پکڑنے کی کوشش کی مگر ———

کہیں جذبے انگلی سے پکڑے جاتے ہیں؟

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں پی کر کمرے سے باہر چلی گئی!

سات

ذرا چھریری، ذرا دبلی، ذرا نازک، ذرا پتلی۔ بہت ہی اونچی اور باریک ایڑی کی سینڈل پہن کر، تیزی سے ٹپ ٹپ کرتی، چلتی ہوئی سوسن پورے بومن لاج میں بڑی ٹماخن اور چھمک چھلو سی مشہور تھی۔

وہ اس وقت بل کھاتی ہوئی بڑی تیزی سے بومن کے قریب سے گذری جا رہی تھی کہ خوش بڈھے نے مسکرا کر سوسن کو کمر سے پکڑ کر اور گھسیٹ کر اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ اور اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"یہ نیا فیشن ہے بالوں کا؟"

"نہیں!" سوسن اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولی "یہ تو بہت پرانا مگر آج کل پھر سے نئے فیشن میں آ رہا ہے!!"

سوسن کے بال سیدھے کٹے ہوئے، بائیں طرف کے کندھے سے گر کر سیدھے نیچے جا کر سامنے سینے پر گرتے تھے۔ دائیں طرف کے بال بڑی سختی سے کانوں کے پیچھے سے کھینچ کر موڑ دئے گئے تھے۔

"اس طرح کے بالوں میں کنگھی کرنا پڑتی ہوگی؟"
بومن نے پوچھا۔ اور اس کے ہاتھ کمر سے اوپر کی طرف جانے لگے۔
"اس وقت جانے دو سلیٹھ!" سوسن بومن کے گھٹنوں پر بیٹھی بیٹھی کسمسائی۔
"میں اس وقت چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
سوسن سے بومن جی کا مذاق بس ہلکی سی چھیڑ چھاڑ اور ٹٹول بازی تک محدود تھا۔ اور اتنا مذاق بھی ایلس کی غیر موجودگی میں ہوتا تھا۔ حالاں کہ ایلس اس سے بخوبی آگاہ تھی۔

اتنے بڑے گھر میں، اتنے نوکروں چاکروں کی موجودگی میں، ایلس کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ اپنا ایک جاسوسی سسٹم قائم کرے، مالک کے جاسوسی سسٹم کے توڑ میں!
اور ایلس دو ٹیڑھے جاسوسی چندوں کے علاوہ!
نیچے طبقے کے نوکر پیشہ لوگ اپنا الگ جاسوسی نظام قائم رکھتے تھے۔ حالاں کہ سوسن کو ان کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ اپنے کام میں بے حد مشاق تھی۔ اس قدر کہ ایلس اندر کو لے کر کھنڈالے جانے کے بعد گھر کا سارا انتظام سوسن کے سپرد کر گئی تھی۔ اور یوں اکثر ہوتا تھا۔

سوسن شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر لونا ولہ میں سلیٹھ بومن کی جائیداد کی دیکھ بھال کرنے والے کارندوں میں سے ایک معمولی قسم کا کارندہ تھا۔ جو اکثر بمبئی سے غائب رہتا تھا۔ اور سوسن ان عورتوں میں سے تھی جنہیں شوہر غائب، عاشق حاضر قسم کے محاورے زیادہ پسند آتے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سوسن کی اپنی چالاکی ہی سے اس کے شوہر کا تقرر بمبئی سے باہر لونا ولے میں ہوا تھا۔
اپنی ملازمت کے شروع کے چند ماہ ہی سوسن نے سر بومن کے پیچھے جاگتے میں صرف کئے تھے۔ مگر بہت جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ بڈھے کی پسند کچھ اور ہے۔

اس لئے سوسن نے اپنی توجہ جلدی ہی اس سے ہٹالی۔

سوسن اپنے حلقے میں بڑی نک چڑھی مشہور تھی کیونکہ ایک بار اونچا داؤں کھیلنے کے بعد اس نے محسوس کر لیا تھا کہ بجائے اس کے کہ خود نچلی سطح سے اوپر کا داؤں کھیلا جائے۔ یہ کہیں زیادہ خطرناک ہے کہ وہ خود اونچی سطح پر بیٹھ کر نچلے سطح کے لوگوں کو اس پر داؤ کھیلنے پر مجبور کرے۔ یعنی اب وہ خود ایک اونچا داؤ تھی۔

سوسن کی نگاہ سر بومن کے لیے چوڑے علے خیلے میں کبھی کسی ایسے مرد پر نہیں جاتی تھی۔ جس کی تنخواہ ایک ہزار سے زیادہ ہو۔ اور وہ اس میں بے حد خوش تھی کہ وہ بڑی نک چڑھی ہے۔

"غصے میں بھنائی ہوئی کیوں ہو؟"

سر بومن نے خوش دلی سے پوچھا۔

"اُنہہ۔ ہے ایک بور۔ دو دن سے برابر ٹیلیفون کر رہا ہے۔ دو تین دفعہ مجھ سے ڈانٹ کھا چکا ہے۔ پھر بھی برابر ٹیلیفون کرتا رہتا ہے۔ شاید اب میری آواز پہچان گیا ہے۔ اس لئے میرے ریسیور اٹھاتے ہی میرے ہیلو کہنے پر ریسیور رکھ دیتا ہے۔ ڈیم سوائن!"

"کون ہے؟ تمہارا کوئی نیا عاشق؟؟"

"میرا عاشق؟ ڈونٹ بی فنی؟" سوسن چڑچڑائی "ہر وقت انڈو کو پوچھتا رہتا ہے!"

بڈھے نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس نے آہستہ سے سوسن کو اپنے گھٹنے سے اتار دیا۔ اور بولا۔

"انڈو نہیں اچھو ٹی بالکن کہو؟!"

سر بومن میں یہ حیرت خیز بات تھی کہ وہ جتنی جلدی بے تکلف ہوتا تھا اتنی

جلدی ہی پر تکلف بھی۔ اب وہ پھر سے مالک تھا۔

"ہاں! چھوٹی مالکن!"

سوسن نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ اور خود اب کھڑی ہو گئی۔

"دوبارہ وہ ٹیلیفون کرے تو مجھے کنکشن دیدینا۔ اور اگر میں گھر پر نہ ملوں تو اسے کل کے لئے لنچ سے پندرہ منٹ پہلے کا وقت دیدینا۔"

"ممکن ہے وہ دوبارہ ٹیلیفون نہ کرے ایسی کس کے ڈانٹ دی ہے میں نے!"

سوسن کہنے لگی۔

مگر سر لومن جا چکا تھا۔ سوسن نے اس کی پیٹھ سے جو کہا اس کا بھی لومن جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوسن سر ہلا کر اپنے آپ سے بولی۔

"بڈھا پگلا گیا ہے اس سلم گرل کے لئے!"

وہ سیڑھیوں سے کھٹا کھٹ نیچے دوسری منزل پر چلی گئی۔ وہاں اسے الوز مل گیا۔ جو باورچی خانے کا رچرڈ برٹن تھا۔ اور صرف مغلئی کھانے تیار کرنے میں مشہور تھا۔ جو ہفتے میں دو بار یا پھر خاص خاص دعوتوں میں تیار ہوتے تھے۔ اس لئے اس کے پاس بہت وقت بچ جاتا تھا۔ جسے وہ ESTABLISHMENT کی خادماؤں کے لئے وقف کر دیتا تھا۔

"تم نے رتنا بائی کو دیکھا؟"

الوز نے سوسن سے پوچھا۔

رتنا بائی کمتی بائی کا نیا نام تھا۔ امّی بائی خود ہی سوچ کر لومن نے بعد میں رد کر دیا تھا۔ کمتی بائی اگر گھٹیا نام تھا تو امی بائی سستا سوچ سمجھ کر سر لومن نے رتنا بائی تجویز کیا تھا۔ اب وہ اس محل سالاج میں اسی نام سے پکاری جاتی تھی۔

"کیا ہوا ہے اس کو؟"

"سیٹھ نے کہا ہے ابھی اسے ایک مہینے تک کوئی کام نہ دیا جائے۔ بس دیکھئے اچھے، صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ اور دن میں دو دفعہ مل مل کر نہائے۔ چنانچہ اس وقت رتنا بائی نہا دھو کر ہار سنگار سے فارغ ہو کر نئے کپڑے بدل کر..... تم خود دیکھ لو ذرا اپنی آنکھوں سے!"

انور نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

سوسن اس کے ساتھ دوسری منزل کے عقب کے ایک کمرے میں چلی گئی جس کی کھڑکیاں نیچے کے عقب میں کھلتی تھیں۔

یہاں کمتی بائی عرف رتنا بائی اپنے کھچڑی بال کے ایک جھولے پر بیٹھی بڑے رومانٹک انداز میں جھول رہی تھی۔ اور ایک گجراتی لڑکی لیٹ گا رہی تھی۔ جھولے کے قریب بڈھے مالی برتو کی بیوی بنگی جو عمر میں رتنا بائی سے بھی بڑی ہوگی، کم سے کم دو چار سال اس سے کم بھی ہو۔ بار بار جھولے کو آہستہ سے پینگ دیدیتی تھی کبھی ربڑ کا فوارہ اٹھائے باڑ کو بھی پانی دیدیتی تھی۔

پینگ روک کر رتنا بائی نے بنگی سے پوچھا۔

"اماں کہیں سے خضاب تو لا دو!"

بنگی کو غصہ تو بہت آیا کہ یہ بڈھی کھوسٹ مجھے اماں کہتی ہے۔ میں تو ابھی جوان ہوں۔ اور اگر جوان نہیں ہوں تو عمر میں اس سے ضرور پانچ دس پندرہ سال کم کی ہوں۔ پھر بھی یہ مجھے اماں کہتی ہے۔ اور خود کو کتنی چھوٹی جو چو پو پو بتاتی ہے۔ سالی، حرامزادی خود میری اماں کی عمر کی ہوگی!

مگر مجھے اپنی اماں کہہ کر اپنی عمر کم کرتی ہے۔ آگ لگے اس کے چونڈے میں!!

یہاں تک سوچ کر مینگی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مگر نئی نئی آئی ہے، مینگی نے سوچا۔ اور دس دن سے پڑی پڑی روٹیاں توڑ رہی ہے اور سیٹھ نے ابھی اسے کام پر نہیں لگایا ہے۔ اور دوسری نوکرانیوں سے بہتر سلوک ہو رہا ہے، اس سے۔ جانے کیا بات ہے۔ بگاڑ اس سے اچھا نہیں ہے، اس لئے وہ لہجہ بدل کر اپنے ٹوٹے دانتوں سے ہنس کر بولی۔

"وہ ایک خضاب لاتے تو ہیں میرے لئے، پر نام اس کا نہ جانوں میں۔" مینگی اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بڑی ادا سے بولی۔ "آج اُن سے کہہ کر ضرور تیرے لئے بھی منگوا دوں گی بہنا۔"

"ہاں ضرور منگوا دینا، اماں!"

رتنا بائی نے پھر بات اماں کہہ کر ختم کی۔ "اچھا! بہنا کہہ کر گویا آپ بھی میری ہم عمر ہو گئیں!! نہ منہ دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ اور چلی ہیں اپنی عمر کم کرتے کرتے میری برابری کرنے، یہ نہ ہونے دیا میں نے ابھی

پھر ایک لمبا سانس کھینچ کر رتنا بائی مینگی سے بولی۔

"کیا بتاؤں اماں۔ کچھ نزلے نے کچھ مصیبتوں نے میرے بال اتنی جلدی سفید کر دئے پر عمر اتنی تو نہیں ہے اماں!"

رتنا بائی نے اپنے کھلے بالوں کو گردن سے ایک جھٹکا دیا۔ جیسا اس نے فلم میری محبت تیری نشانی میں ہیروئن کو کرتے دیکھا تھا۔

"پھر وہی اماں!!"

مینگی پیٹھ موڑ کر غصہ سے بڑبڑائی۔ اور اس غصے میں اس نے ربڑ کے فوارے کی زوردار پچھوار اس تیزی سے باڑھ پر گرائی کہ ہری ٹہنیاں پانی کے بوجھ سے لچک لچک کر دہری ہونے لگیں۔

سوسن ہنس کر بولی۔

"بڑھیا پر پھر سے جوبن آرہا ہے!"

وہ اور انور دونوں پردے کو تھوڑا سا سرکا کے کھڑکی میں سر ڈالے کھڑے تھے۔ انور نے سوسن کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ سوسن کی نگاہیں رتنا بائی کی اداؤں پر جمی تھیں وہ پھر مسکرا کر بولی۔

"اس بڑھیا کو اگر جلدی کوئی کام نہ دیا گیا۔ تو بالکل پاگل ہو جائے گی بھئی تمہیں کیا تم لگے رہو اپنے کام میں۔"

اتنا کہہ کر سوسن نے زور سے انور کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور مسکرا کر تیز تیز قدموں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئی نچلی منزل کو چلی گئی۔

انور نے غصے سے بڑبڑا کے کہا۔

"سالی دو مہینے سے نخرے کر رہی ہے، نہ جانے کیا بات ہے؟"

مہاسکر نے غصے میں آکر ٹیلی فون کی ڈائریکٹری اپنے بیٹے رنجیت کے سر پہ دے ماری۔

رنجیت ذرا سا پیچھے ہٹ گیا ورنہ ناک سے خون بہنے لگتا۔ اس کے سارے جسم میں اس کی ناک ہی سب سے نازک تھی۔ وہ اپنے باپ کے غصے سے واقف تھا۔ اور باپ اس کی ناک کی کمزوری سے۔

"تم ابھی تک اندو سے نہیں ملے؟"

"کتنی دفعہ کوشش کر چکا ہوں!"

"کسی نوکر کو رشوت دے کر رسائی حاصل کرو۔ یہ لو پچاس روپیہ!"

مگر رجنیت نے پچاس روپیہ جیب میں ڈال کر آہستہ سے پوچھا۔

"پہلے تو آپ اندو کے اس قدر خلاف تھے؟!"

"پہلے وہ ایسی نہ تھی۔"

"کیا اس کی شکل وصورت میں فرق پڑ گیا؟ یا اس کے کریکٹر میں۔ وہ تو وہی اندو ہے۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہاں فرق پڑا ہے؟"

رجنیت بولا۔

"سچی محبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رومیو جولیٹ ....."

اس کے باپ نے ٹوک کر کہا۔

"شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، وہ سب قصے میں پڑھ چکا ہوں۔ ان کی فلمیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ وہ سب حوالے دینے کے لئے بہت عمدہ ہیں۔ میرے بیٹے، زندگی کچھ اور چیز ہے!"

"مگر آپ نے ہی تو کہا تھا اگر تم نے اندو سے شادی کی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔"

"اور اب میں کہتا ہوں اگر تم نے اس سے شادی نہیں کی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔"

"میرے لئے شادی کی بات بھی اس قدر اہم نہیں ہے۔ میں صرف اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتاجی کیا آپ نے کبھی محبت نہیں کی!؟"

"میں اپنے گیراج سے محبت کرتا ہوں۔ اور اگر تم اندو سے کہہ سن کر سر بومن سے اس کی گاڑیوں کی مرمت کا سالانہ ٹھیکہ مجھے دلوا سکو..... تمہیں کچھ معلوم بھی ہے احمق!

اے ون گیراج کا مالک سربومن کی گاڑیوں کے تین سال کے ٹھیکے سے لکھ پتی بن چکا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"سربومن کی پرائیویٹ اور ذاتی گاڑیوں کی تعداد تمہیں معلوم ہے؟ بمبئی میں اس کی دو ویکسٹائل ملیں ہیں۔ ان کی گاڑیوں کی تعداد تجھے معلوم ہے؟ اچھا! پھر پن ویل میں اس کا ایک بہت بڑا فارم ہے۔ دس گاڑیاں اور ٹرک وہاں پر ہیں۔ اور کتنے ہی تو اس کے دوسرے آفس ہیں۔ یہ تو موٹا موٹا حساب بتایا ہے میں نے تجھ کو!"

"میں نے جب اندو کو دو کروڑ کی بوتل دیدی تو اب اس سے گاڑیوں کا ٹھیکہ مانگوں گا۔"

"وہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ بوتل تمہارے پاس ہوتی تم اسے اپنے پاس رکھتے۔ اُسے تم لے کر اپنا حق طلب کرنے کے لئے سربومن کے پاس جاتے تو آج تم اس کی جائیداد کے وارث ہوتے۔ اور پھر تم اندو سے شادی بھی کر سکتے تھے۔ اب بہت مشکل ہے ڈیم فول....."

"اندو مجھ سے محبت کرتی ہے!"

"کرتی تھی!"

"وہ اب بھی کرتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے!"

"میرا دل کہتا ہے.... تم الو کے پٹھے ہو۔ ورنہ وہ اب تک تم سے ملنے کے لئے کیوں نہ آئی؟ ——— اگر اس کا دل چاہتا تو اُسے کون روک سکتا تھا؟ ایں....." باپ نے ڈائریکٹری اُٹھا کر اُس کے صفحے درست کئے اور اُسے پھر میز پر رکھا۔ "اب تو چھوٹی چھوٹی سی عنایتیں ہی تمہارے حصے میں آسکتی ہیں! جیسے

گیراج کا ٹھیکہ!!..... یا....."

"یا کیا؟"

"یا کوئی پٹرول پمپ۔ سُنا ہے سر بومن کے بہت سے پٹرول پمپ ہیں۔"

"آپ کتنا جانتے ہیں سر بومن کے بارے میں!؟"

رنجیت نے متعرلفی نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک گیراج اونر کو جاننا پڑتا ہے۔ بمبئی شہر میں کتنی گاڑیاں ہیں؟ کس علاقے میں کتنے گیراج ہیں؟ کتنی گاڑیاں کس امیر کے پاس ہیں؟ اس اطلاع کے بغیر کوئی گیراج نہیں چل سکتا۔"

اندو اب تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ اندو کے متعلق تمہارے جتنے بنائی ڈھکوسلے ہیں۔ یعنی سچی محبت۔ غریبی۔ ساری زندگی تم میرے ہو۔ جھونپڑپٹی کی زندگی۔ سارا جیون تمہارے چرنوں میں گذار دوں گی۔ وہ سب بدل چکے ہیں۔ اب صرف گیراج کا ٹھیکہ مانگو..... یا....."

اتنے میں میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی!

بھاسکر نے ٹیلی فون اُٹھا لیا اور کچھ بات کر کے ٹیلیفون کا ریسیور واپس رکھ کر بولا۔

"سر بومن نے تمہیں بلا بھیجا ہے۔"

بھاسکر کا چہرہ خوشی سے کھلنے لگا۔

"کون جانے اس بڈھے کو تم پر دیا آ جائے اور وہ تمہاری شادی.....

نہیں، نہیں..... مگر یہ ممکن نہیں ہے۔

اِس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔

اِس لئے۔

صرف وہی مانگو
جو تمہیں مل جائے
یعنی
گیراج کے لئے اس کی گاڑیوں کا ٹھیکہ!"
"میں کہتا ہوں گیراج کے ٹھیکے پر۔"
نوجوان رنجیت نے بھڑک کر کہا۔
باپ نے پھر غصے سے ڈائریکٹری بیٹے کی ناک پر پھینکی۔ مگر رنجیت وار بچا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

لیں کورس سے حاجی علی کے ناکے کی طرف جاتے ہوئے رنجیت نے سوچا۔
"مگر بڈھے نے مجھے بلایا کیوں ہے؟ خود سے؟ اس میں کوئی چال ہے؟ یا ہمدردی ہے!
اتنے دنوں سے اس نے مجھے ملنے نہیں دیا۔
تو اب ——
ظاہر ہے ہمدردی تو ہو ہی نہیں سکتی! ہو بھی سکتی ہے۔
بڈھا عجیب و غریب آدمی ہے۔ سنکی اور تیز مزاج اور باؤلا۔ دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہے۔ ورنہ اس طرح کوئی جھونپڑیوں میں رہنے والی کسی لڑکی کو دو کروڑ کی جائیداد کا وارث نہیں بناتا؟! یہ آدمی ضرور محبت کرنے والے کی طرح پاگل ہے۔ ہو سکتا ہے وہ خود اندو کو دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہو!

اندو کے تن میں گرفت میں لے لینے کی ہزاروں ادائیں ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے مگر بڈھا بیاسی برس کا ہے۔ تو کیا ہوا۔ مواصرف یہ کہ اتنی بڑی جائیداد کے مالک کو لڑکیوں کی کمی نہیں ہو سکتی چاہے اس کی عمر سو سے اوپر کیوں نہ ہو جائے۔ کچھ بھی ہو اب جو اس نے بلایا ہے۔ تو اسے جانا چاہیئے۔ ممکن ہے اندو سے ملنے کی کوئی صورت نکلے۔ ممکن ہے وہ خود ..... خود اس بڈھے کے دل میں دیا آ جائے۔ جیسا اس کے باپ نے کہا تھا اور کہہ کر رد کر دیا تھا۔

کیا ممکن نہیں ہے اس دنیا میں!

کل تک کون کہہ سکتا تھا کہ اندو گندی کھولی سے نکل کر دو کروڑ کی جائیداد کی مالک بن جائے گی؟!

کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن ڈیوک آف ونڈسر اپنا تاج و تخت، دنیا کی سب سے بڑی حکومت اور بادشاہت اس عورت کا واقعہ ہے یہ مشینوں اور گیراجوں کے عہد کا رومان ہے یہ۔ ہو سکتا ہے بڈھے کے دل میں دیا آ جائے یا اندو نے اپنی محبت کو چھوڑ دینے سے انکار کر دیا ہو۔

ہو سکتا ہے مجھے خود اندو کے بلانے پر بلایا گیا ہو۔

ہو سکتا ہے بڈھا میرا امتحان لینا چاہتا ہو۔ چالاکی سے مجھ سے اندو کے بارے میں میری محبت کا راز اگلوانا چاہتا ہو۔ اور بعد میں اندو کو مجھ سے ملنے کے لئے ہمیشہ کے لئے ممنوع کر دے۔

یہ بھی ممکن ہے .... وہ بھی ممکن ہے ..... کچھ بھی ممکن ہے!

بہر حال مجھے ..... مجھے بہت ہی ..... ہاں معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے اور وہ بڈھا ٹیڑھا کائیاں ہے۔ اوپر سے ہنستا رہتا ہے۔ مگر اس کی آنکھیں بڑی چالاک ہیں۔ بہت کچھ دیکھا ہے ان آنکھوں نے۔ لگتا ہے میرے دل کے اندر گھس کر

میرے دل کے ہر راز کو ٹٹول کر باہر لے آئیں گی۔ مجھے اس انٹرویو میں بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ لیکن اگر اندو بھی وہاں ہوئی تو میری سٹی گم ہو جائے گی۔ میں چالاکی کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکوں گا۔

"محبت اعلیٰ ظرف حماقت کا دوسرا نام ہے"۔ میرا باپ مجھ سے کہا کرتا ہے۔ مگر..... اس بیوقوفی میں کیسی عجیب سی لذت سی ہے۔ پاؤں زمین سے اٹھ جاتے ہیں۔ اندو کے ساتھ اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ ورنہ پاؤں ہر وقت زمین میں دھنستے معلوم دیتے ہیں اور زندگی میں چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

اندو مجھے کہیں اوپر فضاؤں میں، خلاؤں میں لے جاتی ہے۔ لگتا ہے میرا کوئی وزن ہی نہیں ہے۔ لگتا ہے جیسے میں چاند کو بھی چھو سکتا ہوں۔ لوگ ابھی تک وہاں چاند تک پہنچے نہیں ہیں۔ مگر میں نے چاند کو چھو لیا ہے۔

ہو سکتا ہے اندو نے مجھے بلایا ہو۔ اور اس لئے کہ وہ اپنی مجبوری بیان کر کے مجھے انکار کر دینا چاہتی ہو..... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

میں نے چاند کو چھو لیا ہے!——

حاجی علی ناکے کا بس اسٹاپ آ گیا۔

آٹھ

بومن جی اپنے گھر کے پرائیویٹ آفس میں تھا۔ رنجیت اس کی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر چھ ٹیلی فون تھے۔ تین دائیں طرف، تین بائیں طرف۔ انٹرویو کوئی دس منٹ سے جاری تھا۔

بیچ بیچ میں ٹیلی فون آتے اور بومن جی بے حد فیصلہ کن لہجے میں احکام صادر کرتا۔ رنجیت کو محسوس ہوا جیسے صرف اس کے بارے میں بومن جی کوئی فیصلہ کرنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ ورنہ یہ انٹرویو اتنی دیر تک کیوں چلتا؟ جس میں اب تک نہایت غیر اہم سوالات پوچھے جا رہے تھے۔

بالآخر سر بومن کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے قلمدان سے ایک پنسل اٹھائی، ایک چھوٹا سا پیڈ اٹھایا۔ اپنے سامنے رکھ لیا۔ اور کہنے لگا۔

"میرے ہاں کام کرو گے؟"

"کون سا کام؟" رنجیت نے پوچھا۔

"شوفر!"

"کس کا؟"

"میرا..... مطلب یہ ہے کہ گھر کا۔ اور بھی شوفر ہیں۔ لیکن تمہیں میں سری نگر بھیجنا چاہتا ہوں۔ چند دنوں میں اندو بھی وہاں جا رہی ہے۔ مگر وہ تو ہوائی جہاز سے جائیگی۔ میں یہاں سے ایک خاص گاڑی اس کے لئے بھیجنا چاہتا ہوں۔ بڑی گاڑی چلا لیتے ہو نا؟!"

"جی ہاں! مگر بمبئی سے باہر کبھی نہیں گیا۔ میرا مطلب ہے زیادہ دور نہیں سری نگر تک جانے کا راستہ میں نہیں جانتا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ تمہارے ساتھ ایک اور شوفر بھی جائے گا دوسری گاڑی لے کر! عبدالرحمان راستہ جانتا ہے۔ ساتھ میں سیٹھ کارس جی کرسٹ جی بھی جا رہے ہیں۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ کیوں کہ جو شوفر میری ذاتی گاڑی یا گاڑیاں چلاتے ہیں۔ انھیں میں سال میں چار دفعہ وردیاں دیتا ہوں۔ دو ٹائم کا کھانا دیتا ہوں اور ساڑھے تین سو روپیہ پگار۔

اگر تم اچھی طرح سے کام کروگے تو بہت خوش رہوگے۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ اتنی تنخواہ تمہیں بمبئی میں کہیں نہیں ملے گی۔ بیس برس کے پرانے تجربہ کار ڈرائیور کو بھی زیادہ سے زیادہ دو سو روپیہ ملتے ہیں۔ تم معلوم کر سکتے ہو!"

"مجھے معلوم ہے سیٹھ!!"

"تو تم کو یہ کام منظور ہے؟"

منظور نہ بھی ہوتا تو بھی ریجنیت خوشی سے اسے منظور کر لیتا!

ٹھیک ہے!

لائسنس اس کے پاس تھا۔ مگر گاڑی چلانے کا ایسا تجربہ تو اس کے پاس نہیں تھا۔ کہ وہ یہاں سے سری نگر تک گاڑی چلا سکتا۔ مگر اندو سری نگر جا رہی

تھی اور وہ اور کسی طرح سے نہ سہی اِس طرح سے اندو کے قریب رہ سکے گا۔

اندو ـــــ اور کشمیر ـــــ اور فرصت!

اور ساڑھے تین سو روپے!!

اور ضدی باپ سے دور رہنے کا موقع!!!

کسی حالت میں وہ اِسے نامنظور نہیں کر سکتا تھا۔

بومن جی اب تک پیڈ پر اس کے متعلق ضروری احکامات لکھ کر اپنے دستخط کر چکا تھا۔ اس نے پیڈ سے ورق پھاڑ کر رنجیت کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہاں سے دائیں طرف چوتھے بنگلے کوین ولا میں چلے جاؤ۔ وہاں میرا بڑا دفتر ہے۔ وہاں یہ کاغذ دکھا کر اپنا اپائنٹ ولس لے لو۔ اور باقی سب باتیں، وہ لوگ تمہیں سمجھا دیں گے۔

تمہاری وردی آج ہی تیار ہو جائے گی۔

کل صبح تمہیں کارس جی گیا تھے عبدالرحمان کو لے کر سری نگر کے لئے چلدیا ہو گا۔"

رنجیت کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سر بومن نے کہا۔

"سنو!"

رنجیت واپس آ کر میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"جی!"

اُس نے سر بومن کی طرف جرأت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا۔ سر بومن اب کیا پوچھنے والا ہے۔

"تمہارا اور اندو کا اِدھر آنے سے پہلے کوئی افیئر تو نہیں تھا؟"

کتنے لمبے اور پیچیدہ راستوں سے گذر کر سر بومن اب یہاں تک پہنچا تھا کیونکہ

وہ سوال جو شائد اس قدر اہم تھا، سربومن کے لئے۔ اُس نے اب تک نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔

رنجیت کے جی میں تو آیا کہ صاف اور برملا کہہ دے

ـــــ آپ لفڑے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے تو امدو سے محبت ہے اور امدو کو مجھ سے ـــــ !

مگر اس نے اپنے آپ کو روک دیا۔ اور بغیر کسی اضطراب کے، کسی ہچکچاہٹ کے کامل سکون سے، جس کے لئے وہ حاجی علی سے یہاں تک اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔ اس نے سربومن سے کہا۔

"جی نہیں! میرا اور اس کا کوئی لفڑا نہیں ہے۔"

"اور اگر کبھی تھا تو آج کے بعد نہیں ہوگا۔"

سربومن نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔

"نہ تھا۔ نہ ہوگا۔" رنجیت نے بھی اسی کڑے لہجے میں جواب دیا مگر جواب دیتے وقت اس کا چہرہ کانوں تک تمتما گیا۔ سربومن نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا۔

"جانتے ہو اب وہ میری بیٹی ہے!"

"مجھے معلوم ہے سیٹھ جی۔"

"اگر تم اپنے کام سے کام رکھو گے تو ترقی کر جاؤ گے۔ سیٹھ بومن سزا دینا جانتا ہے اور خوش کرنا بھی جانتا ہے۔"

"مجھے اُمید ہے میں آپ کو خوش کر سکوں گا۔" رنجیت نے خاصی دلجمعی سے جواب دیا۔ چند لمحہ پہلے اس نے اپنے چہرے پر یک لخت خون کی یورش محسوس کی تھی، اب جا چکی تھی۔ وہ اب اپنے آپے میں تھا۔ بڈھا بہت کائیاں تھا۔ اسلئے رنجیت کو بھی بہت

سنبھل کے چلنا ہوگا۔

"آل رائٹ! اب تم جا سکتے ہو۔"

رنجیت کے جانے کے بعد سیٹھ نے گھنٹی بجا کے کارس جی کو طلب کیا۔ جو آدمی گھنٹے سے باہر بیٹھا تھا۔

"کشمیر گورنمنٹ کا جواب تسلی بخش نہیں ہے۔"

"بھدرواہ کی پائٹرامٹس کی کانوں کے متعلق؟" کارس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"ہاں تسلی بخش تو نہیں ہے۔" کارس جی نے جواب میں کہا۔

"تم سری نگر جا کے خود کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرو!"

"چلا جاؤں گا۔"

"کل ہی چلے جاؤ!"

"کل ہی چلا جاؤں گا۔"

"بھدرواہ کی کانیں تم نے دیکھی ہیں۔"

"جی نہیں۔ پچھلی دفعہ سارے انجینئر گئے تھے۔ اُن ہی کی رپورٹ کشمیر گورنمنٹ کے زیرِ غور ہے۔"

"تو اچھا ہے اب کی بار تم خود بھدرواہ جا کے اُن کانوں کو دیکھ آؤ!"

"تو۔۔۔ اس ۔۔۔ سب کام میں ایک ماہ سے اوپر لگ جائے گا۔"

"ہاں لگ جائیگا۔ تمہارے ساتھ عبدالرحمان خوفر جا رہا ہے اور ڈاج لیکر رنجیت جائیگا۔"

"کون رنجیت؟"

"وہی لڑکا!" بومن جی نے غیر معمولی لہجے میں کہا۔

"اچھا وہی لڑکا!؟" کارس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"وہ اندو کا شوہر ہوگا" سربومن نے اسے بتایا۔

"کیا اندو بھی جائیں گی؟" کارس جی اپنی خوشی چھپا نہ سکا۔

"نہیں وہ نہیں جائے گی" سربومن نے مسکرا کر کہا۔ "مگر یہ بات رجنیت کو نہ بتائی جائے!"

کارس جی نے غور سے سربومن کی طرف دیکھا۔ اب وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھنے لگا تھا۔ سربومن نے پھر کہا۔ "رجنیت کو یہی معلوم رہے کہ اندو کشمیر آنے والی ہے۔ آنے والی ہے سری نگر ـــــ بھدرواہ ـــــ جموں۔ سارے سفر میں رجنیت تمہارے ہمراہ رہے گا۔ بھدرواہ سے واپس سری نگر آنے پر تمہیں یہاں سے ٹیلیگرام ملے گا کہ اندو کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اتنے میں تم اپنا کام بھی ختم کر چکے ہوگے!؟"

"جی ہاں!"

"اس کے بعد ہی تمہیں یہ ٹیلی گرام ملے گا۔ پھر تم بذریعہ ہوائی جہاز واپس آجانا۔ عبدالرحمان اور رجنیت گاڑیاں لے کر واپس آجائیں گے۔"

"مجھے مہینہ ڈیڑھ مہینہ لگ جائیگا" کارس جی نے اوپر سے کہا۔ اندر سے سوچا۔

بڈھے کا ارادہ کیا ہے؟ یہ مجھے معلوم کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اور رجنیت دونوں کو یہاں سے ہٹانا چاہتا ہے۔ رجنیت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔

مگر مجھے کیوں؟ ـــــ اس میں کیا چال ہے؟؟

یہ معلوم کرنا پڑے گا۔

"تو تم کل روانہ ہو سکتے ہو۔"

"جی بہت اچھا"

کارس جی کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے سے گذر کر، پائیں باغ میں پہنچا۔ چڑیوں کے چہچہانے کے باوجود عجیب سناٹا سا تھا۔ یہ سناٹا شاید ہرے سبز رنگ کے ساتھ جاتا ہے۔ اور پتوں کے سکون کا انعکاس ہے

جہاں جہاں ہرے پتوں کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں پر اطمینان بھری خاموشی ہوتی ہے۔ اور اگر کہیں پتوں میں چھپا ہوا کوئی پرندہ بولتا بھی ہے تو اس کی سُریلی آواز بھی خاموشی کا ایک سُر ہی معلوم ہوتی ہے۔

عمل جاری ہے۔

ہرے پتے اپنے دامن پھیلائے روشنی کی کرنیں سمیٹ رہے ہیں۔ اور اپنے باریک ریشوں کے جال کے اندر زندگی بُن رہے ہیں۔

اُن کے اوپر آسمان نیلا ہے۔

کہیں نیلے میں آسمان گدلا ہے!

بالکل گدلا بھی نہیں ہے۔ کہیں کہیں پر بوجھل بھورے بادل ہیں تو کہیں پر مرمریں کنگروں اور برجیوں والے سفید بادل!!

نیچے شیریں والا میں،

الفانترو کے ہرے بھرے پیڑ کے نیچے،

سورج کی چمکتی ہوئی شطرنجی میں،

ایک چھوٹے سے غالیچہ پر،

بجنی پہنے اندو لیٹی ہے۔ اور اوری سے مالش کرا رہی ہے۔ پورے جسم پر زیتون کا تیل پالش کی طرح چمک رہا ہے۔

سر بومن کا ہاتھ اپنی آفس میز پر کے اوپر پڑے ہوئے سیاہی چوس کی کھردری

سطح کو چھوتا ہے، اس کاغذ کی سطح کتنی کھردری اور ٹھنڈی اور بے حس ہے!
رنجیت کو کوین ولا کے خزانچی نے سفر خرچ کے لئے چار سو روپیہ دئے ہیں۔

انوری کا ہاتھ بڑی مشاقی سے اندو کی کمر سے بنی ہوئی باہوں پر چل رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اب سختی دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگلے دو تین ماہ میں یہ انگلیاں بالکل نرم پڑ جائیں گی۔

انوری خاندانی مالیشیوں کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار پشتوں سے وہ لوگ نواب رامپور کے دربار سے متعلق تھے۔

اب وہ دربار ختم ہو گئے۔

نئے دربار کھل گئے۔

ایلس قریب میں بیٹھی آرام کرسی پر کسی دوسرے ڈنائن کی بنی پہنے بیٹھی ہے۔ اور کچھ بن رہی ہے۔

بھدرواہ کی پائرائیٹس کی کانوں میں سیٹھ کو اس قدر تو دلچسپی نہیں تھی۔

پھر سیٹھ بومن میرا ڈیڑھ ماہ کیوں برباد کر رہا ہے۔

مگر میں انکار نہیں کر سکتا۔

سر بومن کیا کھیل کھیلنا چاہتا ہے؟

کارس ایک پن کو لے کر، اسے اپنے میز پر رکھے ہوئے گتے پر موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

"مجھے سب باتیں، سب کچھ معلوم کرنا پڑے گا، اندو سے صاف صاف میں سرینگر تو جا ہی رہا ہوں اس لئے اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔

'اندو ایسی لڑکی تو نہیں ہے جو اپنے رنجیت کی محبت کو ٹھکرا دے گی؟
مگر اتنا بڑا چانس!؟
میرا باپ کس قدر خوش ہوگا؟ میرے سری نگر جانے پر!
بڈھے بومن کی نوکری پر!!'

'خوش تو میری ماں بھی ہے۔
ہر وقت پلنگ پر لیٹی لیٹی حکم چلایا کرتی ہے۔ اتنا سکھی تو میری ماں کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا!'
کمی بائی برآمدے سے نیچے باغیچے میں ہالش کراتی ہوئی اندو کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔
سر کے اوپر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔
آرام کرسی میں نرم ربڑ کے گدے بچھے ہیں۔
کوئی کام کرنے کو نہیں ہے۔
کمی بائی آنکھیں بند کر کے آنکھیں کھولتی ہے۔

'ہاں وہی سب کچھ ہے
یہ خواب نہیں ہے۔ جھوٹ نہیں ہے
مگر رنجیت کو دیکھ کیسے سکتی ہوں؟ یہ لوگ مجھے چاروں طرف سے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ سوچنے تک کے لئے ایک منٹ نہیں دیتے!
ہری جو پنج والا ایک خوبصورت طوطا الفانزو آم کے بغل سے گردن نکال کے کھا رہا ہے۔ بالکل سر بومن معلوم ہوتا ہے۔

اندو آپ ہی آپ ہنسنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" ایلس نے بنائی روک کر پوچھا

"کچھ نہیں!" اندو نے ایلس کا بدن، سفید گورا بدن دیکھا۔

'یہ مجھ سے زیادہ سفید ہے۔ مگر بدن سے گوشت سرک رہا ہے۔ دھیرے دھیرے سرکتا جاتا ہے۔ ادھر سے بندھ باندھو تو ادھر سے سرکنے لگتا ہے!

اندو کے سارے جسم میں کہیں فالتو گوشت نہیں ہے۔ سوائے وہاں کہ جہاں چاہیئے۔

کیسا کسا ہوا خود مختار بدن ہے؟!!

کبھی پیٹی یا باندھ کی حاجت نہیں۔ یہ عمر ہے، عمر۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ ایلس اپنی جوانی میں بے حد حسین رہی ہوگی!

اب بھی!..... ہاں اب بھی..... جگہ جگہ سے دل کش ہے۔

جوانی میں عورت سر سے پاؤں تک دل کش ہوتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے دل کشی صرف کسی کسی جگہ پر رہ جاتی ہے۔

پھر ایک دن!

دل کشی روٹھ کر چلی جاتی، پھر صرف کھنڈر رہ جاتے ہیں

پھر کھنڈر بھی نہیں رہتے!

یہی حال مرد کا ہے، فلک کا ہے، سورج کا ہے، ستاروں کا ہے، کس کا نہیں ہے؟ مگر وہ تخیل تو نہیں مرتا۔ اس پیڑ تلے اس کٹے ہوئے بدن کا عکس وقت کے آئینہ خانے میں، کہیں پر ضرور محفوظ رہے گا۔

ایک خوبصورت لباس کی طرح!

اس پیڑ کی شاخ سے لٹکا ہوا۔

کبھی دو سو برس بعد میں یہاں اس پیڑ تلے پھر آؤں گی اور اس شاخ سے اس لباس کو اٹھا کر پھر سے اتنی ہی حسین بن جاؤں گی۔

کوئی مجھے دیکھ نہ سکے گا۔ مگر میں اپنی نظر میں پھر اتنی ہی حسین ہو جاؤں گی۔

الوری نے اب اس کی انگلیاں کھول دیں اور اب اس کے سینے پر مالش کر رہی تھی۔

یہ مرمریں سفید گنبد، جو الوری کی مشاق انگلیوں کے ہلکے سے دباؤ سے دب جاتے ہیں!

یہ برف میں ڈوبی ہوئی ان چھوئی چوٹیاں، جن کے اندر زندگی اور جوانی اور اس کے جوبن کا لاوا بہتا ہے۔

تی بائی دیکھتے دیکھتے اپنی بیٹی کے لئے شدید رقابت محسوس کرنے لگی۔

"بھگوان نے مجھے ایسی خوبصورتی نہ دی،

کبھی ایسا جوبن نہ دیا،

بس چند دنوں کے لئے لاوا بھڑکا تھا،

کچھ چمک،

کچھ گرج،

کچھ انگارے،

پھر بہت سی راکھ اڑی اور لاوا سرد پڑ گیا۔ سکیل کر ڈھلک گیا۔ اب اس کے سینے کے اندر راکھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ اندو کو اب کبھی ایسی زندگی گذارنے نہ دے گی۔

اگر ایسی ایسی عمر تیس برسوں جوان رہ سکتی ہیں تو اندو کو تو بھگوان نے سب کچھ دے دیا ہے۔ اب وہ اندو کی ایسی حفاظت کرے گی، ایسی حفاظت کرے گی کہ زندگی جھلسا کر

راکھ بنا دینے والی عزیبی کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے گا۔

انوری کی چکنی چکنی ہتھیلیوں کے ہلکے ہلکے دباؤ اور پتلی پتلی انگلیوں کے نازک پھیلاؤ بڑھتے گئے۔

بڑھتے گئے!

سینے پر چک پھیریاں کھاتے گئے!!

اندو کی آنکھوں میں بجلیاں دوڑنے لگیں۔

ہونٹ ذرا سے کھل گئے۔ اور منہ کے لعاب دار لیس سے گیلے ہونے لگے۔ سانس رک رک چلنے لگی۔

اُس نے انوری کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بس اب اوپر گردن پر!"

ہاتھ کی روک سے ہیجان ٹکرا کر اوپر اچھلا۔ پھر پھوار کی طرح برس گیا۔ ایک عجیب سی ملائمیت اندو کو اپنے سارے بدن میں محسوس ہونے لگی۔

اس نے اپنی خمار آلود پلکیں بڑی مشکل سے اوپر اٹھائیں۔ اور بیخود سی آواز میں ایلس سے پوچھا۔

"کل کا پروگرام کیا ہے؟"

اندو ایلس کے قریب!

اس کے پاؤں کے بالکل قریب!!

اندو کا چہرہ اور گردن ——!!!

'میرے خدا! اندو کی گردن کس قدر لمبی ہے۔ موزل وائن کی بوتل کی لمبی ڈنڈی کی طرح!

نازک اور طرحدار ایک کلی کی طرح اس کے شفاف بلوریں سینے پر رکھی ہے!'

اگر ایلس اس خوب صورت گردن پر زور سے پاؤں رکھ کر دبا دے! جلدی سے ایلس نے اپنا پاؤں پیچھے کر لیا۔

"اگر وہ ایک عورت ہو کر یوں محسوس کر سکتی ہے تو اُن مردوں کے احساسات کیا اس سے مختلف ہوتے ہیں جو زبردستی ریپ کر جاتے ہیں۔

کیا یہ ایک ہی وحشی جذبے کے دو رخ ہیں؟!

رقابت اور ریپ ——!؟"

ایلس نے جلدی سے اپنی بنائی روک کر اپنے خیالات کی رو دوسری طرف موڑ کر اپنی گود میں رکھی ہوئی کاپی کھولی۔

اور ——

دھیرے دھیرے پڑھنے لگی۔

—— "صبح سات بجے بیڈ ٹی"

"یہ بیڈ ٹی بھی کتنی عمدہ چیز ہے! صبح آنکھ کھلتے ہی پہلی انگڑائی کے ساتھ ہی بیڈ ٹی آجاتی ہے۔

خورشید بائی کے کنگن کھنکتے ہیں۔

اس کی ہلکی سی ہنسی۔

"گڈ مارننگ مس صاحب!"

اور پھر نازک چینی کے پیالوں کے کھنکنے کی آواز!! اور وہ ہلکی سنہری یا سبز چائے۔ صحیح دم دے کر تیار کی ہوئی۔ جس کا ہر گھونٹ امرت کا سا مزا دیتا ہے۔

—— "ساڑھے سات بجے گلوریا منہ دھلانے آئے گی"

گلوریا صرف میک اپ سنبھالنے کے لئے رکھی گئی ہے۔

ساڑھے سات بجے وہ پلاسٹک کی ٹرے میں میک اپ کا سامان لے کر آئیگی۔

میک اپ نہیں کرے گی، صرف رات کا میک اپ اُتارے گی۔
چہرے سے رات کی کریم صاف کرے گی۔

۳۰۔ پھر سارے چہرے کو ہیزل ملک سے دھوئے گی۔ آنکھوں کی پلکیں، کان کی لویں، ٹھوڑی کے نیچے کی تکن، ـــــ ایک ایک چیز کو ہیزل کے دودھ سے دھوئے گی۔
چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔

ہونٹ اپنے قدرتی رنگ میں گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و نازک نظر آتے ہیں، اُن میں وہ قابلِ کیفیت نہیں ہوتی، جو گہرے لپ اسٹک کے بعد آتی ہے۔

اندو کو ہلکا ہلکا لپ اسٹک پسند نہیں ہے۔ جس کے لگانے سے ہونٹ بیجان اور جذام زدہ نظر آتے ہیں۔

وہ گہرے لپ اسٹک کی قائل ہوتی جا رہی ہے!

ـــــ "ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ ہوگا۔"

ناشتہ کبھی اصلی مائی سن کی چائنا میں، جرمنی سے امپورٹ کی گئی چائنا میں، کبھی چاندی کی منقش طشتریوں، کٹوریوں میں، جیسے دسترخوان پر چاندی کے پھول کھلے ہوں۔

پھر چمچے چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجتے ہیں۔

کانٹوں سے کھانے کے ٹکڑے پلکوں کی طرح اٹھائے جاتے ہیں! نیپ کن ہونٹوں سے مس ہوتے ہیں۔

ـــــ "ساڑھے نو بجے بال روم ڈانس کی مشق۔"

ـــــ "ساڑھے دس بجے ہندوستانی موسیقی۔"

ـــــ "ساڑھے گیارہ بجے ہندوستانی رقص۔"

ـــــ "بارہ بجے مالش اور غسل۔"

—— "ڈیڑھ بجے —————— لنچ"

—— "ڈھائی بجے —————— آرام"

—— "ساڑھے چار بجے: چائے اور پھر چہرے کا غسل اور میک اپ۔ آرائش اور ڈریس"

—— "چھ بجے: —————— لکی پوائنٹ تک ڈرائیو!"

—— "سات بج کے پندرہ منٹ پر: واپسی"

—— "سات بج کے پندرہ منٹ سے سوا آٹھ بجے تک: گورنس سے تربیت"

—— "ساڑھے آٹھ بجے: —— ڈنر"

—— "دس سے ساڑھے دس تک: دن کا میک اپ اتار کے، رات کے لئے چہرے، گردن، اور ہاتھوں کی انگلیوں کے لئے کریم ہاتھ"

—— "ساڑھے دس بجے: شب خوابی کے کپڑے پہن کر ریٹائر کر جانا"

ایلس نے کاپی بند کر دی۔

"افوہ!" اندو نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "کس قدر کام ہے۔ ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا، امیر عورتوں کو اس قدر مصروف رہنا پڑتا ہے"

ایلس چپ رہی۔

اندو نے منہ کھول کر جمائی لی۔

فوراً ایلس چلائی

"منہ پر ہاتھ رکھو!"

"ساری!" اندو نے معافی مانگی "پرسوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"پرسوں جیکب گوڈمین آ رہے ہیں!"

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"یہ تمہیں سکھائیں گے کہ سگریٹ کیسے پیا جاتا ہے؟ شراب کیسے پی جاتی ہے؟

اور پلائی جاتی ہے؟"

"میں نہ سگریٹ پیتی ہوں، نہ شراب!"

"اب تمہیں دونوں چیزیں پینی پڑیں گی۔"

"کوئی زبردستی ہے؟"

"نہیں! زبردستی نہیں ہے، مگر سیکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کبھی کبھار سوسائٹی کی خاطر لوگوں کو سگریٹ پینی کرنا پڑتا ہے۔ سگریٹ جلانا پڑتا ہے۔"

"اس میں کیا مشکل ہے۔ ہاتھ میں سگریٹ لیا، ماچس سے جلا لیا۔ ہزاروں لوگوں کو دیکھ چکی ہوں۔ جس کو سگریٹ دینا ہو اس کے ہاتھوں میں سگریٹ کی ڈبی دیدی یا جس سالا خود ہے ڈھیٹ ڈرے گا!"

"پھر جلا کیا؟"

الیس نے ڈانٹ پلائی۔

"ساری!"

اندو شرمسار ہو کے بولی۔

"سگریٹ پینے پلانے، آفر کرنے، انکار کرنے، لائٹر سے جلانے، یا کسی کو لائٹر سے نہ جلانے۔ اور ایک کے سگریٹ کو دوسرے کے سگریٹ پر فوقیت دینے کے ہزار طریقے ہیں۔

یہ ایک باقاعدہ تربیت ہے۔ جیسے ہائی سوسائٹی میں گھومنے والی لڑکیوں کو سیکھنا پڑتا ہے۔

فرض کر لو!

ایک محفل میں تمہارے گرد دو نوجوان کھڑے ہیں۔

ایک تمہیں زیادہ پسند کرتا ہے۔

دوسرا کم پسند کرتا ہے۔
دونوں تمہیں سگریٹ آفر کرتے ہیں، تم کس سے سگریٹ لو گی؟"
"ظاہر ہے جو مجھے زیادہ پسند ہے!"
"اس سے دوسرے نوجوان کا دل دکھے گا!"
الیس نے کہا۔
"دکھنے دو، مجھے کیا؟"
"یہ بُرے آداب ہیں۔"
"پھر کیا کرنا ہوگا مجھے؟"
اندو نے پوچھا۔
"فرض کر لو! تمہارا پسندیدہ نوجوان تمہیں معمولی سائز کے سگریٹ آفر کرتا ہے۔
اور دوسرے نوجوان کے پاس کنگ سائز کے سگریٹ ہیں۔
تم بآسانی کہہ سکتی ہو کہ
'مجھے یہ چھوٹے سگریٹ پسند ہیں، ان میں تمباکو کم ہوتی ہے'
یا
'مجھے کنگ سائز پسند ہیں، ان کا جلتا ہوا سرا ہونٹوں سے بہت دور رہتا ہے!'
یا
'مجھے ٹن میں رکھے ہوئے سگریٹ زیادہ پسند ہیں، ان کی خوشبو دیر تک ٹن میں محفوظ رہتی ہے'۔
یا تم کہہ سکتی ہو کہ
'مجھے تو ڈبہ پسند ہے یہ زیادہ مجھوری ہے'۔ یا 'میں تو ہمیشہ سگریٹ کیس میں سے پیتی ہوں'۔ اس صورت میں جبکہ تمہارے پسندیدہ نوجوان کے ہاتھ میں سگریٹ کیس ہو اور

دوسرے کے ہاتھ میں نہ ہو۔"

"اور اگر دونوں کے ہاتھ میں ایک ہی برینڈ، ایک ہی ڈبہ، ایک ہی طرح کا لائٹر ہو تو...؟"

"تو تمہیں سگریٹ اپنے پسندیدہ نوجوان سے لینا ہوگا۔ اور دوسرے نوجوان کے لائٹر سے جلانا ہوگا۔ دونوں کو لٹکائے رکھو۔ مگر یائی ڈیر بات چیت کرنے میں بڑی ہی احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ ایک نوجوان نے اگر سگریٹ پیش کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

"خوب! تو آپ کو چھوٹا پسند ہے۔"

اور دوسرے نے بڑھ کر یوں کہا۔

"تو لمبا آپ کو کیوں ناپسند ہے؟"

تو تم کیا کہو گی؟"

اندو کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ بولی۔

"میں چپل اٹھا کر منہ پر مار دوں گی، ان دونوں کے۔"

"چچ چچ۔ یہ بھی آداب محفل کے خلاف ہے۔ تم ہنس کر یوں بھی ٹال سکتی ہو۔ پہلے سے:

"آپ کے چھوٹے منہ سے بڑی بات زیب نہیں دیتی!"

دوسرے سے:

"لمبا اس لئے ناپسند ہے کہ بیوقوف ہوتا ہے!!"

دونوں کھسیا جائیں گے بغلیں جھانکنے لگیں گے۔"

اندو عجیب نگاہوں سے ایلس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اسی طرح شراب پینے پلانے کی بات ہے۔" ایلس بات کو بڑھاتے ہوئے بولی۔

"سینکڑوں طرح کی شرابیں ہوتی ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا۔ کون سی شراب کس وقت پی جاتی ہے؟ کس طرح پیش کی جاتی ہے؟ کتنی انڈیلی جاتی ہے؟ کس طرح انڈیلی جاتی ہے؟ کس کھانے کے ساتھ، کس محفل میں، کیسی شراب چلتی ہے؟ شراب کے ساتھ نقل کیا ہوں؟ لیڈیز کو کس محفل میں نہیں پینا چاہیئے؟ کس محفل میں وہ پی سکتی ہیں؟ کس محفل میں دراصل نہ پی کر یہ ظاہر کر سکتی ہیں کہ وہ پی رہی ہیں؟ پی کر نہ پینے اور نہ پی کر پینے کے بھی انداز ہیں۔

شراب کا رنگ، ذائقہ، عمر پرکھنے کے ایک سو ایک طریقے ہیں۔ جو تمہیں دس پندرہ دن میں نہیں آسکتے۔ ایک دو سال میں کہیں آئیں گے۔

ابھی تو جیکب گوڈمین صرف چند دنوں کے لئے آرہے ہیں۔ چند چھوٹی موٹی ضروری باتیں سمجھانے کے لئے ـــــــ"

اندو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور بڑی بیزاری سے منہ کھول کر ایک ہلکی سی ڈکار لی۔

"چھی!" الیس غصے سے چلائی "شریف اور معزز عورتیں کبھی کسی دوسرے کے سامنے ڈکار نہیں لیتیں!"

"پھر وہ کیا کرتی ہیں؟"

اندو نے پوچھا۔

"کہیں اکیلے میں جا کر!"

"ایک چھوٹی سی ڈکار کے لئے اتنی مصیبت؟ تمہارے یہاں ہر بات میں مصیبت ہے۔ ہمارے ہاں لوگ روز ڈکار لیتے ہیں۔

ہاتھ میں سگرٹ لے کر چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہیں۔

غٹا غٹ شراب پی جاتے ہیں!"

"وہ لوگ جاہل ہیں!" الیس نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

"جاہل ہوں گے۔" اندو بولی۔ "ضرور ہوں گے مگر ان کے ہاں وقت ضائع نہیں ہوتا۔ جتنی رقمیں تم مجھے بتا رہی ہو ان میں وقت کتنا ضائع ہوتا ہے؟"

"مائی ڈیر! ان لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت ہے کہاں؟ اور اگر ہم لوگ وقت ضائع نہ کریں تو کیا کریں؟"

"میں بمبئی جانا چاہتی ہوں!"

اندو نے ایک دم فیصلہ کیا۔

اور ـــــ اٹھ کر خالیچے پر کھڑی ہو گئی۔

انوری اب اس کے ٹخنے سہلا رہی تھی، بدستور سہلاتی رہی۔

"تم بمبئی کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"بس ایک دن کے لئے!"

"کیا کام ہے؟"

"ہے کوئی!"

"مجھے بتاؤ؟"

"نہیں بتاؤں گی!!"

"تم بمبئی نہیں جا سکتیں!"

"کیوں نہیں؟"

"سیٹھ کا حکم ہے۔"

"تو میں اسی وقت جاؤں گی۔"

"احمق مت بنو!"

"تو بس نہیں کراؤں گی۔"

"مالشی مقتر یا ختم ہے، تم خلل کر سکتی ہو"
الیس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔
اندو سٹپٹا کر سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں اپنی ماں کے قریب سے گذر کر
تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کے اندر پہنچ گئی۔
گلوریا اسے خلل دینے کے لئے آئی۔
پلنگ کے بعد قلیوں نے تک کسی نے اسے اکیلا نہیں رہنے دیا۔ عجب طرح کی قید
ہے وہ یہاں! سونے کی زنجیروں میں بندھی ہوئی۔
پلنگ کے بعد اسے اپنے بیڈ روم میں محسوس ہوا کہ اب وہ اکیلی ہے۔ اتنے بیاد
گھنٹے کے لئے، کچھ دیر کے لئے تنہا ہے۔ اس نے اپنے جوتے کاٹے، پھر اتار کر
پھر پاؤں پٹکے۔ پھر پرس اٹھا کر اس کے اندر جھانکا۔ ڈیڑھ دو تصویر رہ گئے
اس نے کپڑے نہیں بدلے۔
خواب گاہ کی پیچھے کی کھڑکی سے کود کر نیچے اتر گئی۔
شیریں والا کی ڈھلوانوں سے اتر کر،
سایہ دار درختوں کی آڑ میں چھپتے چھپتے،
وہ نیچے بازار تک آ گئی۔
وہاں سے اسٹیشن پہنچ کر اس نے بمبئی جانے والی پہلی گاڑی کا ٹکٹ کٹوایا۔
آدھے گھنٹے میں گاڑی آنے والی تھی۔
کئی لوگ اسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مگر اسے ان لوگوں کی پروا نہ تھی۔
بس اسے یہی ڈر تھا۔
"کوئی شیریں والا سے نہ آ جائے!"
"یا اسے پہچان کر واپس نہ لے جائے!!"

سب سے زیادہ وہ ایلس سے ڈرتی تھی۔
مگر آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ اور شیریں دلاسے کوئی نہ آیا۔ شائد اُسے چھپ کر بھاگتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔
-گاڑی آئی۔
وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں اطمینان سے بیٹھ گئی۔

نو

اب وہ بھاسکر گیراج کے سامنے کھڑی تھی۔ رنجیت کا باپ ایک پرانی موٹر کے انجن میں سر دیئے، فکر میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اندو کو نہیں دیکھا۔ مگر اس کے دو مددگاروں نے دیکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک نے بھاسکر کو ٹھوکا دے کر خبردار کیا۔ جب بھاسکر نے سر اٹھا کر اپنے مددگار کی طرف دیکھا۔ تو اس نے خاموشی سے اندو کی طرف اشارہ کیا۔

پہلے تو بھاسکر نے اندو کو بالکل نہیں پہچانا۔ پھر جب بالکل قریب آ کے اُس نے اپنی عینک اتاری تو اندو کو پہچان کر چونک گیا۔ چونک کر مہذب کھڑا ہو گیا۔ یہ بالکل نئی بات تھی اندو کے لئے! ــــ کیوں کہ اندو کو معلوم تھا کہ رنجیت کا باپ اُسے سخت ناپسند کرتا ہے!! اور اس سلسلہ میں بھاسکر نے کبھی کوئی لگی لپٹی روا نہ رکھی تھی۔

اِس وقت بھاسکر کا اُسے اِس درجہ مہذب نگاہوں سے دیکھنا اُسے بڑا عجیب سا لگا۔ اچھا بھی لگا۔ پھر بھی وہ کچھ شرما سی رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا، وہ کیسے بھاسکر سے بات کرے؟

پرس کے ہنڈل کی سنہری زنجیر سے چند ساعت کھیلنے کے بعد اس نے نظریں جھکائے ہوئے پوچھا۔

"رنجیت کہاں ہے؟"

"رنجیت!!" بھاسکر حیرت سے بولا "آپ کو معلوم نہیں!"

"نہیں!"

"وہ تو سری نگر گیا ہے۔"

"سری نگر!" اندو نے چونک کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "کیوں!؟"

"آپ کو یہ بھی معلوم نہیں!!" بھاسکر نے پھر پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اور معلوم بھی کیسے ہوتا؟ وہ..... وہ..... جانے سے پہلے مجھ سے ملا تک نہیں!" نہ چاہتے ہوئے بھی اندو کے لہجے میں خفگی آ گئی۔ آواز لرز گئی۔

'اس میں کیا راز ہے؟' بھاسکر نے سوچا۔ رنجیت کا ماما! اندو سے اس قدر پوشیدہ کیوں رکھا گیا ہے؟ رنجیت نے تو کہا تھا کہ اندو بھی کشمیر جا رہی ہے مگر اس لڑکی کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تو کچھ معلوم نہیں ہے اور اگر اس سے یہ سب باتیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ تو وہ خود اس اسرار پر پردہ ہٹانے والا کون ہوتا ہے؟ لیکن یہ اس سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جس سے اس کے بیٹے کی نوکری پر حرف آئے۔ سیٹھ بدھن کی گاڑیاں اس کے گیراج میں آنے لگی تھیں۔ نہیں..... نہیں..... اسے اس معاملے میں بے حد محتاط ہو کر چلنا ہوگا۔

"بتایا تو اس نے کبھی مجھ کو کچھ نہیں ہے!" بھاسکر نے جھوٹا بول دیا۔

"اس لئے اب میں بھی آپ کو کیا بتا سکتا ہوں!"

"کیا وہ..... وہ..... اکیلا گیا ہے؟"

اندو نے سوال کیا۔

"جی ہاں! بالکل اکیلا۔"

اندو کو تھوڑا اطمینان ہوا۔ مگر پھر شک و شبے، وہم اور وسوسے تاریک دھبوں کی طرح اس کے ذہن میں پھیلنے لگے۔

'سری نگر؟ سری نگر وہ کیسے چلا گیا؟ اور اکیلا کیوں گیا وہ؟'

"کب تک آئے گا؟" اس نے رک رک کر پوچھا۔

"کہا تھا مہینہ لگ جائے گا؟ دو مہینے لگ جائیں! کچھ ٹھیک سے بتایا نہیں۔"

بھاسکر نے سوچا زیادہ وضاحت کرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔

اندو بالکل ہی ٹوٹ کر بکھرنے لگی تو بھاسکر نے آگے بڑھ کر مہذبانہ لہجے میں کہا۔

"کہیے میں آپ کو کفن پریڈ تک پہنچا دوں!"

"نہیں میں چلی جاؤں گی!"

آنسو اس کی آنکھوں میں آنے لگے تھے۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ رنجیت کا باپ انھیں دیکھ لے۔

'رنجیت کیسے سری نگر چلا گیا اس سے ملے بغیر! اُسے کچھ بتائے بغیر!!... سری نگر اکیلا کیوں گیا ہوگا وہ؟ سری نگر جانے کے لیے اس نے کہاں سے رقم حاصل کی؟ اس کا سخت گیر باپ تو اُسے کبھی ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتا!... رنجیت اس سے کیسے بے وفا ہو سکتا ہے؟'

یہ اس کا دل ماننے کو ابھی تک تیار نہیں تھا۔

'سب کچھ اس کے ہاتھوں میں دے کر وہ اس سے کیسے الگ ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی دوسری لڑکی اس کی زندگی میں آگئی تھی؟ کیا اس کی خاطر وہ اب تک مجھ سے شادی نہیں کرتا تھا؟ اور سارا الزام اپنے باپ پر دھرتا تھا:

اِسی طرح کے وسوسوں میں گھری ہوئی سر جھکائے اندو دھیرے دھیرے گیراج سے مہالکشمی اسٹیشن کے ناکے کی طرف جانے لگی۔ جہاں اُسے کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔
چند قدم بڑھ کر یکایک وہ سامنے سے آنے والی ایک لڑکی سے ٹکرا گئی۔
اندو نے گردن اٹھا کر دیکھا۔
رانی بالا تھی۔
"اِندو ــــ ؟! تم یہاں کہاں!"
رانی بالا خوشی سے چیخ اٹھی۔
"ایسے ہی۔"
"پیدل ــــ ؟!"
"ٹیکسی میں نے چھوڑ دی تھی۔"
"مگر ٹیکسی کیوں؟ گاڑی کیوں نہیں!؟"
رانی بالا نے اندو کی بھیگی بھیگی پلکیں دیکھ کر کچھ اندازہ کیا مگر ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکی۔ بھاسکر گیراج کی طرف ایک نظر ڈال کر بولی۔
"کیا رنجیت کے باپ سے ملنے آئی تھیں؟"
"ہاں!"
"سُنا ہے رنجیت سری نگر گیا ہے!؟"
"ہاں!!"
اندو نے آہستہ سے کہا۔ وہ اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
وہ دونوں چلتی چلتی اب جھونپڑ پٹی کے قریب آ گئی تھیں۔
رانی بالا نے کہا۔
"تمہاری جھگی اسی طرح بند پڑی ہے۔"

"اچھا!"

"ایک چوکیدار بھی روز سوتا ہے۔ سیٹھ بومن نے رکھ دیا ہے۔"

"اچھا!" اندو نے پوچھا۔

"اچھا کیا؟ تمہیں معلوم نہیں ہے؟" رانی بالا نے حسد و رقابت سے تلملا کر کہا۔

"خواہ مخواہ بن رہی ہو۔"

"نہیں سچ کہتی ہوں رانی! مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"گمن بھائی اب روز ہمارے گھر آتا ہے۔" رانی بالا کا سینہ فخر اور غرور سے تننے لگا۔

"اچھا!" اندو کے منہ سے نکلا

"ہاں! اور اب وہ بیس ہزار روپیہ دینے کو تیار ہے۔ پر میری ماں ایک فلاٹ اور گاڑی بھی مانگتی ہے۔"

رانی نے اندو کو بتایا۔

"بہت خوب!" اندو نے اوپری دل سے کہا۔ اُسے رانی کے عاشقوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اتنے میں جھونپڑپٹی کی بہت سی عورتیں، بچے، لڑکے لڑکیاں، بوڑھے مرد، بیکار نوجوان، اُسے پہچان کر نکل آئے تھے۔ اور حیرت سے اس کے گرد ہالہ بنائے کھڑے ہو گئے تھے۔ اور اس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگے۔

"بھگوان نے تمہیں سب کچھ دیدیا ہے تو ہم غریبوں کا بھی خیال کرو!" بڈھی بھکیا بائی اپنی پھٹی پرانی آواز میں بولی۔

"ہاں سیٹھ سے کہو بھاڑا کم کر دے، ماں!" کوریا کھانستا ہوا بولا۔ "میری کھولی کی چھت گرنے والی ہے۔"

یہ چمنی بائی کی آواز تھی جس کی کھولی اندو کی کھولی سے لگی ہوئی تھی۔

"دو نل لگوا دو!"

سترہ برس کا مسلمان، کالا، سوکھا، لمبا، اپنی جھگڑالو آواز میں کہنے لگا۔

"پہلے سامنے میدان میں حاجت کے لئے جاتے تھے۔ پھر اب وہ زمین سیمنٹ پائپ بنانے والی کمپنی نے لے لی ہے۔ جس کے چاروں طرف لوہے کی باڑھ لگا دی ہے۔ اب ساری عورتیں کدھر جائیں؟"

"سیٹھ بومن کے کارخانے میں کہہ کر چوکیدار لگا دو!" بائیس برس کا تامیے بولا۔

"ابھی چھ مہینے کی جیل کاٹ کر آیا تھا اس لئے ایسا بول رہا تھا۔ دو تین دفعہ جانے کے بعد پھر ایسا نہیں بولے گا۔"

"اندو..... اندو..... مجھ کو بھیل پوری کے لئے چار آنے دو!" چھ برس کی پورنیا لجاجت سے بولی۔

"میری بچی کی تین مہینے سے فیس نہیں گئی ہے!" پورنیا کی ماں لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

گندگی۔ بدبو۔

افلاس۔ مجبوری۔

بھوک۔ بیکاری

غصہ۔ حسد۔

مایوسی!

گہری اگربتی، رستی ہوئی ناسوروں بھری مایوسی!!

خواہشیں چیتھڑوں کی طرح تار تار۔

چیں چیں کرتی میلی بدرنگ آوازیں۔
مکھیوں کی طرح اس کے چاروں طرف بھنبھناتی ہوئی۔
اندو نے اپنا بٹوا کھولا۔

اندو ——

صرف والپور جانے کا کرایہ اور چند روپیہ اوپر رکھ کر باقی سب رقم اس نے بچوں میں بانٹ دی۔
ہجوم اس کے گرد بڑھتا جا رہا تھا۔
اس کے ننانے چھلنے لگے تھے۔
دھکا پیل شروع ہو گئی تھی۔
اور ایک بار تو وہ گرتے گرتے بچی۔ گو کسی کا ارادہ اُسے گرانے کا نہیں تھا۔ اُسے دھکا دینے کا نہیں تھا۔ مگر ان کی روزمرہ کی کٹھنی ہوئی ضروریات ان کی گٹھڑی انتڑیاں دھکا دے کر انہیں اندو کے قریب جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جیسے چاروں طرف سے ضرورت مند ہاتھ اُسے نوچنے پر تل گئے۔
بڑی مشکل سے اندو اپنی جان بچا کر بھاگی۔

اندو ——

بھاگتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں رانی بالا کے اور دوسرے مرد عورتوں کے بے رحم قہقہے سنے۔
جو کچھ اس کے پاس تھا۔
اس کے بٹوے میں تھا۔
وہ سب کچھ تقریباً سب کچھ اُس نے دیدیا تھا۔ مگر وہ احسان مند نہیں تھے، اس کے بالکل۔

شکر گزار بھی نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ چند سکے ان کی غریبی کے سمندر میں گر کر ڈوب چکے تھے۔

بھاسکر گیراج سے مہالکشمی تک دوڑتے دوڑتے اندو کا دم پھول گیا۔ پہلے کبھی نہیں پھولتا تھا۔ مہالکشمی لوکل اسٹیشن کے باہر اُسے ایک ٹیکسی مل گئی۔

وہ جلدی سے اس کا پٹ کھول کر اس میں بیٹھ گئی۔

ڈرائیور نے فلیگ گرایا۔ تو اندو نے کہا۔

"بوری بندر!"

مگر سات رستے کے سرکل تک پہنچکر اندو کا ارادہ بدل گیا۔

اس نے کہا۔

"نہیں کفا پیریڈ لے لو۔"

اب اس وقت اُس میں کھنڈالے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس میں ایلس اور اپنی ماں اور ان دوسری تمام عورتوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی معلوم نہیں کیوں اُسے بڈھے بومن پر اعتماد تھا۔

وہ اُسے دیکھ کر کتنا حیران ہوگا۔

اور ہوا بھی یہی!

بڈھا بومن کھانا کھا کے کافی روم میں کافی پی رہا تھا۔ کہ اندو اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ اس وقت پیالی تپائی پر رکھ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا ہی رہا تھا کہ اُس

نے اپنے سامنے اندو کو کھڑے دیکھا۔

چند لمحوں تک وہ اُسے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھتا رہا۔ پھر جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ اندو ہی ہے تو اُس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

آہستہ سے بولا۔

"تمہیں ڈھونڈنے کے لئے بامبے، کھنڈالا، پونا، ناسک تک پولیس حرکت میں آچکی ہے۔"

چپ چاپ اندو اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی رہی۔ بومن نے بڑے پیار سے اُسے اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اندو کچھ کہے بغیر اس کے قریب صوفے پر گر گئی۔

بومن نے کہا۔

"میں تم سے بات کرنے سے پہلے میں پولیس کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے مل گئی ہو۔"

پولیس ہیڈ کوارٹر سے نمبر ملا کر اس نے اندو کے مل جانے کی خبر بتا دی۔ پھر ریسیور رکھ کر آہستہ سے وہ اندو کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کیوں کہ اندو اب رو رہی تھی۔

"کیا بات ہوئی تم کھنڈالے سے کیوں آ گئیں؟"

اندو نے روتے ہوئے گلے سے کہا۔

"وہاں میرا دل نہیں لگتا۔"

"کیوں کیا کسی طرح کی تکلیف ہے؟ تمہیں وہاں کھانے کی، پینے کی، رہنے کی، لباس کی، نوکروں چاکروں کی، موٹر گاڑی سہیلیوں کی؟ کوئی تکلیف ہے تمہیں؟" بومن نے پوچھا۔

"نہیں!"

"پھر کیوں آگئیں؟"

"دل نہیں لگتا۔" اندو نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ پھر سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ اور رونے لگی۔

بومن کے منہ سے ایک ہلکی سی آہ نکلی۔

اسے معلوم تھا اندو کیوں رو رہی ہے؟

کس کے لئے؟

کیوں اندو کا جی کھنڈالے میں نہیں لگتا؟

اندو سے اُسے بڑی ہمدردی تھی مگر کچھ معنوں میں وہ بھی بے بس اور مجبور تھا۔

وہ دیر تک بڑی شفقت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔

اس کا سر سہلاتا رہا۔

جب اندو کے آنسو تھمے تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کھانا کھالیا؟"

"نہیں!"

سر بومن نے نرم لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔ "پہلے ہاتھ منہ دھولو۔ پھر کھانا کھالو پھر تم سے بات کریں گے۔ جب تک کھنڈالے میں فون پر بات کر لیتا ہوں۔ سب کی بری حالت ہے۔ میں ان سب کو برطرف کر دینے کے حق میں ہوں۔"

"مگر غلطی میری ہے۔" اندو نے پشیمان ہوتے ہوئے کہا۔ "میں خود ہی کسی کو بتائے بنا چلی آئی!"

"تم ابھی بچی ہو۔ انہوں نے تمہاری ٹھیک سے نگہبانی نہیں کی۔"

"انھیں نوکری سے الگ مت کریئے!"

اندو نے تیزی سے بولی۔

"مگر پہلے وعدہ کرو کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرو گی؟!"

"ہاں! وعدہ کرتی ہوں!"

"تو جاؤ منہ ہاتھ دھو کے کھانا کھا لو۔ پھر چند منٹ کے لئے میرے بیڈ روم میں آجانا۔"

کھانے سے فارغ ہو کے جب وہ اس کے بیڈ روم میں پہنچی تو وہ اپنا نائٹ گاؤن پہنے پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔

اس نے اندو کو ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

اس کے گرد ایک ہلکی سی شال لپیٹ دی۔ اور پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

مگر ——

بومن کا اضطراب دیکھ کر اس کے اپنے دل کی حرکت بھی تیز ہو چلی تھی۔

وہ اس کی کرسی سے گھوم کر کمرے کے آخری کونے تک جہاں اس کا رائٹنگ ٹیبل تھا، وہاں تک جاتا تھا۔

پھر واپس اس کے پاس آتا تھا۔ پھر چلا جاتا تھا۔

اسی خاموش اضطراب میں بہت سے منٹ گذر گئے۔

آخر وہ ایک اسٹول لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جانتی ہو تم کتنی بڑی جائیداد کی مالک بننے والی ہو؟"

"ہاں!"

"یہ بھی جانتی ہو کہ اتنی بڑی جائیداد کو سنبھالنے کے لئے عقل چاہیئے؟"

اندو چپ رہی۔

"جانتی ہو؟؟" بومن نے پھر پوچھا۔

"کس طرح کی عقل؟"

اندو نے سوال کیا۔

"مثال کے طور پر ـــــ کیا تمہیں معلوم ہے کارخانہ کیسے چلتا ہے؟"

"نہیں!"

"بزنس شیٹ کسے کہتے ہیں؟"

"نہیں!!"

"اوور ڈرافٹ کسے کہتے ہیں؟"

"نہیں ـــــ!"

"بنک اکاؤنٹ کسے کہتے ہیں؟"

اندو نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا۔

"بنک میں روپیہ کیسے جمع کرتے ہیں؟ کیسے نکالتے ہیں؟

اگر میں کل مر جاؤں تو تم کتنے دن اس جائیداد کو سنبھال پاؤں گی۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس معاملے میں تم اس قدر کوری ہو جیسے پہلے دن کا بچہ!"

اندو کی آنکھوں میں آنسو ابھرنے لگے۔

"رونے سے کام نہیں چلے گا؟"

بومن نے ڈانٹا۔

اندو نے سر جھکا لیا۔

"میں تمہاری تعلیم اور تربیت پر ہزاروں روپیہ خرچ کر رہا ہوں تاکہ تم جلد سے جلد اس قابل ہو جاؤ کہ جو کچھ میں تمہارے لئے چھوڑ جاؤں اُسے تم سلیقے اور قاعدے سے سنبھال کر اپنے پاس رکھ سکو۔ اور تم کہتی ہو کہ تمہارا جی نہیں لگتا ہے!"

بومن پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس کے سامنے آکر بولا!

"میں اگر کل مر جاؤں اور فرض کرو کہ مرنے سے پہلے میں یہ ساری جائیداد اور دولت تمہارے نام لکھ کے مر جاؤں۔ اور تمہاری سوچ بوجھ، تعلیم اور تجربہ کچھ نہیں ہوتا ہے تو ــــ

جانتی ہو ــــ اس صورت میں تم کتنے دن تک اس دولت کو سنبھال کر اپنے پاس رکھ سکتی ہو؟

جانتی ہو کتنے دن تک؟؟"

اندو نے نگاہیں اٹھا کر سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

بومن نے کہا۔

"ایک دن!

صرف ایک دن!!

دوسرے دن صبح ہونے سے پہلے یہ ساری جائداد تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر چپ رہا۔ تاکہ اب تک جو اس نے کہا ہے، وہ اس بے وقوف لڑکی کے دماغ میں بیٹھ جائے۔

پھر بولا۔

"اس لئے تمہاری تربیت کا اتنا مہنگا اور عمدہ انتظام کیا ہے۔ تاکہ تم جلد سے جلد میری وارث بننے کے قابل ہو جاؤ۔ اور تم کہتی ہو کہ تمہارا دل نہیں لگتا!؟"

اندو شرمندہ ہو کر رونے لگی۔

بومن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دیا اور کہنے لگا۔

"کیا تم واپس جاؤ گی اور اپنے آپ کو اس قابل بناؤ گی؟ یا کہ میں تمہاری طرف سے

مایوس ہو جاؤں؟"

اندو سسک سسک کر کہنے لگی۔

"نہیں! میں واپس جاؤں گی اور پوری محنت سے کام لے کر آپ کے بھروسے کو صحیح کر دکھاؤں گی۔"

اندو کے نرم معصوم جذبے والے چہرے پر ایک نیا عزم پیدا ہو رہا تھا۔

بومن نے پیار سے اس کا گال تھپتھپا کر کہا۔

"کل میں خود تمہارے ساتھ گھنڈالے چلوں گا۔ تمہارے لئے اگلے دو ماہ کا پروگرام طے کر کے آؤں گا۔ تمہیں اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھنا چاہیئے تاکہ کوئی ارادہ، خیال تمہارے دل میں نہ آسکے!"

دس

رنجیت نے سن رکھا تھا کہ کشمیر کے نظارے سوئٹزرلینڈ سے زیادہ خوبصورت ہیں کشمیر جنت نظیر ہے اور جس نے اس دنیا میں کشمیر نہیں دیکھا، تو کچھ نہیں دیکھا۔ اور ایک طرح سے یہ سچ بھی تھا۔ اور شروع کے چند دنوں میں اُسے سب کچھ اچھا لگا تھا۔ اور اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا۔ کہ مغربی گھاٹ سے کشمیر کی گھاٹیاں اور کشمیر کے مناظر کے حسن میں وہی فرق تھا جو ایک سیدھی سادھی گنوار دیہاتن اور آرائش جمال سے آراستہ کسی شہری حسینہ میں ہو سکتا ہے۔

لگتا تھا کہ مناظر فطرت نے کشمیر کی ہر لوک پلک اپنے ہاتھ سے سنواری ہے۔ مگر یہ سب کچھ اسے صرف چند دن کے لئے ہی اچھا لگا۔ کیوں کہ اُسے اندو کی آمد کا انتظار تھا اور اس کی آمد کا یقین بھی تھا۔

پھر جوں جوں انتظار کے دن لمبے ہوتے گئے اور جدائی اور حسرت کے فاصلے بڑھتے گئے اسے کشمیر پھیکا، بے رنگ اور بے معنی نظر آنے لگا۔ اندو کے بغیر کشمیر ایسا تھا جیسے کسی دولہا کو دولہن کے بغیر ہنی مون منانے کے لئے کشمیر بھیج دیا جائے۔

کسی منظر میں دل چسپی نہ تھی۔

ہر طرف راکھ کے رنگ کا دھواں دھواں سا اڑتا تھا۔ اور کشمیر کی تمام خوبصورتیوں اور رعنائیوں سے گذرتے ہوئے اُسے ہر دم ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی تک بمبئی کی سڑکیں ناپ رہا ہے۔

پہلے پندرہ بیس روز تک تو اس نے کارس جی سے اندو کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔

پھر اس نے پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔

اور ــــ

دوسرا مہینہ آدھا گذر جانے پر جب کارس جی نے اسے بتایا کہ اندو نہیں آرہی ہے تو اسے کسی طرح کی مایوسی نہیں ہوئی۔ ــــ کیوں کہ پہلے ہی اس قدر مایوس ہو چکا تھا کہ اس اطلاع سے اُسے ایک طرح کی تسلی ہو گئی۔

پھر ــــ

ایک طرح کی خوشی بھی ہوئی!

جب کارس جی نے اسے بتایا کہ اس ماہ کے آخر تک وہ لوگ واپس بمبئی لوٹ جائیں گے۔

اور اب!

وہ دو ماہ کے بعد بمبئی واپس آکر اندو کو لانے کے لئے کھنڈالے بھیجا جا رہا تھا۔ شیریں ولا کے پورچ میں گاڑی روک کر اس نے ایک خادمہ کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع اندو کو بھجوا دی تھی۔ اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندو کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

نچلے ہال سے اُسے طبلے اور گھنگھروؤں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

پھر ہال کے دروازے کا پٹ کھلا۔
چند ساعتوں کے لئے اُسے ایک ناچتی ہوئی لڑکی کا حسین پیکر نظر آیا۔
اناروکلی۔
پھر پٹ کھٹ سے بند ہو گیا۔
ابا!
الیس اس کے سامنے کھڑی تھی۔
رنجیت نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ٹوپی سر سے اتار کر مہذبانہ سلام کیا۔ الیس نے ذرا سا سر ہلا کر اس کا سلام قبول کیا۔
رنجیت نے کہا۔
"ہم لوگ آ گئے ہیں!"
"کتنی گاڑیاں آئی ہیں؟"
الیس نے پوچھا۔
"چار!"
"ٹھیک ہے! تم نیچے گیراج میں اپنی گاڑی لے جاؤ۔ وہیں نوکر خانے میں تمہیں ایک کمرہ مل جائے گا۔ میں نے چوکیدار کو کہہ دیا ہے۔ تم جا سکتے ہو!" اتنا کہہ کر الیس گھوم گئی۔
دروازہ کھول کر ہال کے اندر گئی۔
چند ساعتوں کے لئے پھر پٹ کھلا۔
رنجیت کی بیتاب نگاہیں ناچتی ہوئی انارو کی نگاہوں سے جا ملیں۔ دوسرے لمحے ہی دروازہ بند ہو گیا۔
کیا اس نے مجھے دیکھا تھا؟

شائد نہیں دیکھا ہوگا!؟
ضرور دیکھ لیا ہوگا!!'
دو مختلف سمتوں سے آنے والے بجلی کے دھارے اس ایک نگاہ میں زوردار دھماکے سے مل گئے تھے۔
اس ایک پل میں ——
پہچان کا گہرا سنگم دور دور تک ان کی روح کے ساحلوں پر پھیل گیا تھا۔
پھر دروازہ بند ہو گیا تھا۔
رو کٹ گئی تھی۔
گرسنگم کے پانیوں کا شور ابھی تک اس کی روح میں گونج رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اندو نے اُسے دیکھ لیا ہے۔
اور اب ——
وہ دروازہ کھول کر دوڑتی ہوئی، اس سے ملنے کے لئے چلی آئے گی۔ —— وہ دیر تک بند دروازہ کے باہر کھڑا رہا۔
دھڑکتے دل کے ساتھ!
پھر بجھتے دل کے ساتھ!!
پھر پانی بھاری بند دروازے سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ گیا۔
اندو نہیں آئی!
سوکھی ریت ساحل کے چاروں طرف بکھر گئی۔
بھاری قدموں سے رنجیت سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک.... دو.... تین
چار —— چار ہی تو سیڑھیاں ہیں!!

مگر کتنا لمبا راستہ طے کرتی ہیں۔

ہر سیڑھی پر اس کے قدم بھاری ہوتے گئے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں میں اترتا جا رہا ہے۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے انجن کھولا اور نیچے نوکر خانے کی طرف دیکھا۔

دن بھر وہ اندو کا انتظار کرتا رہا۔

'شاید دوپہر کے کھانے پر وہ اُسے بلا بھیجے گی!'

مگر۔۔۔

دوپہر کا کھانا ہو گیا اور اس کے لئے کھانا بھیج دیا گیا۔

مگر اندو نہیں آئی۔

وہ غصے سے چارپائی پر اوندھا لیٹ گیا۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر غصہ اس قدر زیادہ تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں میں نہیں آ رہے تھے۔

پھر اُسے کھٹکا سا محسوس ہوا تھا دروازے کے باہر۔

'وہ آ گئی!'

بھاگ کر وہ دروازہ تک گیا۔ چند لمحے کھڑا رہ کر اس نے اپنی سانس مجتمع کی۔ باہر سے بھی اسے کسی کی تیز تیز سانسوں کی آواز سی سنائی دے رہی تھی۔

اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

سامنے کوئی نہ تھا۔

برآمدہ خالی پڑا تھا۔

مایوس ہو کر وہ واپس اندر لوٹ گیا۔ دروازہ اس نے زور سے لات مار کر بند کر دیا۔

اور دھڑام سے پھر اپنی چارپائی پر اوندھا گر گیا۔

اب اُسے لگا جیسے دروازے کے باہر وہ کھڑی کھڑی ہنس رہی ہے۔

رنجیت نے غصے سے اٹھ کر بند دروازے کا منہ چڑا دیا۔

"مت آؤ... مت آؤ... مت آؤ..... میں اب زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیا سمجھتی ہو تم!"

شام کے جھٹپٹے میں جب وہ نئی مرسڈیز کو گیراج سے باہر نکال کر اس پر کپڑا پھیر رہا تھا۔ تو اس نے اندو اور سوسن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں نئی مرسڈیز پر تھیں۔ جسے چمکانے میں وہ اس وقت مصروف تھا۔

اندو کی پہلی نظر تو گاڑی ہی پر پڑی تھی۔ مگر جب دوسری نظر ڈرائیور پر پڑی تو بھونچکی سی رہ گئی۔

چلتے چلتے اس کے قدم ٹھٹک سے گئے۔

سوسن کو لگا جیسے وہ ٹھوکر کھا کر گرنے والی ہے۔ اس نے جلدی سے اندو کو سہارا دیا تھا۔ [illegible] نئی نویلی اندو سوسن کی مدد کے بغیر گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

رنجیت کو دیکھ کر اندو کی لانبی پلکوں کے نیچے گلابی گال سرخ ہونے لگے۔ رنجیت نے دیکھا ان دو ڈھائی ماہ میں اندو کی رنگت کیسے نکھر گئی ہے۔

ہاتھ کتنے ملائم نظر آ رہے تھے!

اور ——

ڈوبتی ہوئی شفق میں اس کا گلنار چہرہ، اودے پھولوں والی نرم نیچ شفاف ساڑھی کے آنچل میں کتنا سندر نظر آ رہا تھا!!

رنجیت کے گلے میں کوئی پھانس سی چبھنے لگی۔

اس نے اندو کو دیکھ کر ذرا سا منہ موڑ لیا۔ اور زرد ڈلالین کے لمبے ٹکڑے کو لیکر

بادامی رنگ کی نئی مرسڈیز کو چمکانے لگا۔

شیریں دلا درختوں سے گھرے ہوئے ایک پہاڑی ٹیلے پر واقع تھا۔ نیچے چار موٹر گیراج تھے اور ڈرائیوروں کے لئے کمرے اور نوکر خانے!

سوسن نے اندو کو بتایا تھا کہ سیٹھ نے تمہارے لئے نئی مرسڈیز خریدی ہے اسے دیکھنے کے لئے اندو اس وقت سوسن کے لے نیچے چلی آئی تھی۔

شفق کے ڈھلتے ہوئے نارنجی غبار میں اب شام کا سرمئی رنگ شامل ہو چلا تھا۔ رنجیت نے اپنی گندی پتلون ٹخنوں تک اوپر چڑھائی تھی اور اس کے سانولے مضبوط ہاتھ بڑی مشاقی سے مرسڈیز کی چکنی سطح پر چل رہے تھے۔

سوسن نے کہا۔

"یہ بالکل نیا ماڈل ہے بمبئی میں اس ماڈل کی پہلی گاڑی آئی ہے!"

اندو کے خانے کانپے۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں سوسن سے کہا۔

"اوپر سے ایک شال لے آؤ۔ مجھے سردی لگ رہی ہے!"

سوسن شال لانے اوپر دوڑی دوڑی گئی۔

نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آنے میں کم سے کم دس پندرہ منٹ تو لگیں گے۔ تب تک وہ دونوں اکیلے بات کر سکتے ہیں۔

اندو چند لمحے خاموشی سے رنجیت کی طرف دیکھتی رہی۔ جو اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"یہ نئی مرسڈیز ہے!"

بالآخر اندو نے پوچھ ہی لیا۔

"ہنہ!" رنجیت غرایا۔

"اسے تم بلاتے ہو؟"

"ہم"

رنجیت نے جواب دیا۔

"کل اسی گاڑی میں تم ہمیں لے کے بمبئی چلو گے؟"

"ہو!"

رنجیت ایک لمحے کے لئے دوبارہ منہ کھول کر بولا۔

چند لمحے خاموشی رہی!

ایسے تھمتی لمحے اگر ایسی خاموشی میں گزر گئے تو کیا ہوگا؟! وہ رنجیت کا غصہ سمجھ سکتی تھی۔

مگر ——

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیسے وہ اس کے غصے کو دور کرے؟

اور

جب تک رنجیت کا غصہ دور ہو، سوسن آجائے گی۔ یا ممکن ہے ایسی ہی مثال لے کر آجائے اور دل کی دل ہی میں رہ جائے۔

یکایک وہ بھڑک کر بولی۔

"آخر تم میری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہو؟"

"دیکھ کر کیا کروں گا؟"

رنجیت نے گاڑی پونچھتے پونچھتے پوچھا۔

"تم اس قدر بدل کیوں گئے ہو؟"

اندو نے حیرت زدہ ہو کر اس سے پوچھا۔

"بدلا میں ہوں کہ تم بدلی ہو!"

پہلی بار ہاتھ روک کر رجنیت نے اس کی طرف غصے بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں کہاں بدلی ہوں۔ ڈھائی مہینے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک دفعہ بھی تم مجھ سے ملنے نہیں آئے!"

"میں ملنے کے لئے نہیں آیا ——— !؟ کیا کہتی ہو؟؟ دس بار تو تمہیں ٹیلیفون کیا۔ مگر تمہیں تو مجھ سے بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس لئے بھلا تم کیوں ٹیلیفون پر آتیں؟!"

"مجھے کسی نے تمہارا ٹیلی فون نہیں دیا۔"

اندو نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔"

"نہیں! سچ کہتی ہوں، مجھے تمہارا کوئی ٹیلیفون نہیں ملا۔"

"پھر سیٹھ بومن نے کہا تم کشمیر جانے والی ہو۔ اس لئے میں نے اس کے ہاں ڈرائیور کی نوکری کر لی کہ اس بہانے تمہاری صورت دیکھنے کو مل جائے گی!"

"میں کشمیر جانے والی ہوں!"

"ہاں! دو مہینے پہلے۔ آج سے دو مہینے پہلے۔ ایسا سیٹھ بومن نے مجھ سے کہا تھا۔ میں کارس جی کے ساتھ بمبئی سے گاڑی لے کر سری نگر گیا تھا۔

جنوں،

بھلدرواہ،

کہاں کہاں پھرتا رہا؟

اور روز دل ہی دل میں تمہارا انتظار کرتا رہا، مگر تم نہ آئیں۔"

"میں..... کشمیر..... مگر مجھ سے تو کسی نے کچھ کہا ہی نہیں!؟" اندو حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"اب ایسی بھولی مت بنو! مجھے سری نگر بھیج کر یہاں کھنڈالے عیش کرنے آ گئی ہو؟ اس پر کہتی ہو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے!"

"رنجیت!"

غم اور غصے میں اندو کی آواز گلے میں دبنے لگی۔

"ٹھیک بھی ہے۔ اب تمہارا میرا ساتھ کیا معنی رکھتا ہے؟ تم ایک کروڑپتی لڑکی۔

میں ایک غریب ڈرائیور!

تم اوپر کے بنگلے میں رہنے والی!

میں اس نوکر خانے میں سونے والا؟!" رنجیت کا لہجہ نشتر کی دھار کی طرح تیز تھا۔ "میرا تمہارا ساتھ بھی کیا؟ ..... میں ..... غلطی میری ہے۔ میں نے ایسی غلط امید باندھی کم سے کم ....."

رنجیت گاڑی کے دوسری طرف جا کر مڈگارڈ صاف کرنے لگا۔ اس کی پیٹھ اندو کی طرف تھی۔

پلکوں پر آنسو لئے اندو بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی اور کپکپاتے لہجہ میں بولی۔

"میں وہ نہیں ہوں۔ جو تم مجھے سمجھتے ہو۔

نہ میں بدلی ہوں!

نہ میرا دل بدلا ہے!!

جب تم نہیں آئے تو میں یہاں کھنڈالے سے بھاگ کر چودری سے تم سے ملنے کے لئے اکیلی بھاگ کر گیراج تک گئی تھی۔

تمہارے پتا جی ملے تھے تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سری نگر چلے گئے ہو!"

اتنا کہہ کر اندو رک گئی۔ کیوں کہ سوسن بھاگتی ہوئی شال لے کر قریب آ رہی تھی۔ اندو نے سوسن سے شال لے کر فوراً اوڑھتے ہوئے کہا۔

"بھلا یہ شال کیا اس ساڑھی کے ساتھ چلے گا؟"

"تو اُودا شال تو کوئی ہے نہیں!"

سوسن نے جواب دیا۔

"اودا نہیں ہے تو وہ دوسرا کالا والا لے آؤ، مگر جلدی لے کر آؤ۔" اندو نے حکم دیا۔

سوسن سفید شال لے کر واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رنجیت نے پوچھا۔

"تو پھر میرے پتاجی نے کیا بتایا؟"

"جب وہ بولے تم کشمیر چلے گئے ہو تو میں حیران رہ گئی۔ یہ تو انہوں نے بتایا نہیں کس کے ساتھ گئے ہو؟ اس لئے میرے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ میں سمجھی شائد تم....."

وہ چپ ہو گئی۔

رنجیت کا غصہ دور ہونے لگا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آنے لگی۔ وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

"ہاں! شائد میں.... کیا؟ سمجھا تم نے کہ میں کسی دوسری لڑکی..... کے ساتھ..... ابھی؟"

اندو آنکھیں جھکائے اپنے ناخون سے ساڑھی کے پلّو کو نوچ رہی تھی۔ رنجیت کا جی چاہا وہ اُسے اپنی باہوں میں بھر لے۔

رنجیت کے گھنے بالوں والے گٹھے سینے کو دیکھ کر اندو کا جی چاہا کہ وہ اس کے سینے

پر سر رکھ دے۔ جی چاہا کہ رنجیت خود اسے اپنے گندے میلے ہاتھوں سے سمیٹ لے۔ جی چاہا کہ وہ اسے اٹھا کر پیچھے گاڑی میں پٹخ دے اور خود اسی وقت ڈرائیو کرتا ہوا اسے یہاں سے لے جائے!

جی چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے۔

کمبخت کچھ کہتا کیوں نہیں ہے؟

بس گردن جھکائے، مرسڈیز کی چکنی سطح پر اپنے ہاتھ گھمائے جا رہا ہے۔ جی چاہا کہ اس کے مرسڈیز کی جگہ وہ خود ہوتی۔

پھر اسے رونا آنے لگا۔

"میرے خیال میں یہ بڈھے برہمن کی چال تھی!" رنجیت نے اپنی گردن کھجاتے ہوئے کہا۔ "تم کو کھنڈالے بھیج دیا، مجھے سری نگر!"

"تاکہ ہم مل نہ سکیں؟"

"اور کیا؟"

"ہاں! اب تو یہی معلوم دیتا ہے!"

"بڈھا بڑا چالاک ہے۔"

اندو نے کچھ دیر سوچا، پھر بولی۔

"اب میں اس سے صاف صاف بات کر لوں گی!"

"کیا کہو گی؟"

"جو میرا جی چاہے گا۔" اندو نے شوخ نگاہوں سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا اس سے؟"

"اور اگر وہ نہیں مانا تو؟"

رنجیت نے پوچھا۔

اندو نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"کیسے نہیں مانے گا! اُسے ماننا پڑے گا۔ دیکھو!" اندو نے نئی گاڑی جسے رنجیت اس وقت صاف کر رہا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے کہا "میں نے ذرا سا کہا اور فوراً یہ نئی گاڑی میرے لئے آ گئی!"

"کیا اُسے تم سے....."

رنجیت نے گہرے شک کی نگاہ سے اُسے گھورا۔

"چھی!" اندو چمک کر بولی "کیسی گندی باتیں سوچتے ہو؟ وہ ایسا نہیں ہے، وہ تو مجھے بیٹی کی طرح چاہتا ہے!"

"ایسے قصے میں نے بہت سُنے ہیں!" رنجیت نے کہا "لوگ باگ بیٹی کی طرح چاہتے چاہتے بیوی کی طرح چاہنے لگتے ہیں!!"

گیارہ

نئی دہلی سٹیشن گھاٹ سے اتر رہی تھی۔ پیچھے سیٹ پر الیس اور اندو بیٹھی تھی۔ الیس زعفرانی رنگ کا ایک سلور لس سوئٹر بن رہی تھی۔ اندو رنجیت کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

رنجیت اپنے سامنے کے آئینے کا زاویہ گھما کر بار بار اندو کو دیکھ لیتا تھا۔ مگر اندو صرف اس کی سیدھی تنی ہوئی مضبوط گردن دیکھ سکتی ہے۔ یا اس کی پیٹھ دیکھ کر اس کے موڈ کا اندازہ کر سکتی ہے۔

ویسے اندو کو رنجیت کی برہمی پسند تھی۔

اس میں ایک ایسی محنت گیر مردانگی تھی۔ جس کے آگے جھکنے میں اُسے مزا آرہا تھا۔

رنجیت نے بومن کی قابلیت کے سلسلے میں جو بات کہی تھی۔ اُس پر اندو کو یقین نہیں آیا۔ آج اس کا دل کہتا تھا کہ رنجیت نے محض رقابت سے مرعوب ہو کر یہ بات کہی تھی۔

پھر بھی ریجنت کا یہ فقرہ کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں چبھ گیا تھا۔ ریجنت نہایت خاموشی سے مؤدب بیٹھا بے حد مشاقی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ گزشتہ دو ماہ تک کشمیر کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے چلاتے اس کا ہاتھ بیحد رواں ہو گیا تھا۔

ابا ــــ

اس کی ڈرائیونگ میں ایک پُرسکون اعتماد آ گیا تھا۔ وہ گھاٹ سے نیچے اتر رہے تھے۔

نیچے ہری بھری وادیاں،
کہیں کہیں ہری بھری دوب کے قطعے!
کہیں کہیں ڈھلوانوں پر پیڑوں کے قافلے قطار اندر قطار نیچے چلے جا رہے تھے۔

بڑے بڑے پیڑوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے لچکیلے پیڑ ہرے آنچل کی اوٹ شرمائی لجائی دلہن کی طرح تاکتے۔

ساتھ میں ننھے ننھے سے بچے سے پیڑ شریر بچوں کی طرح ڈھلوانوں پر پھیلتے ہوئے۔ شاید پیڑوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں۔

مرد۔ عورت۔ بچے۔

اکیلا تو کوئی اچھا نہیں لگتا۔

اندو کا دل چاہا کہ وہ ریجنت کے پاس بیٹھ جائے، مگر ایلس دیکھ رہی ہے۔ کوئی بات نہیں!

اندو نے اب مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

وہ اب اس بات کو صاف کر کے رہے گی۔

وہ ریجنت کی ہے۔ ہمیشہ اسی کی ہو کے رہے گی۔

بڈھے کو معلوم ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر وہ اسے بچی کی طرح چاہتا ہے تو.....؟

ایک مرتبہ جوڑا،
مرد آگے آگے،
عورت پیچھے پیچھے،
مرد لاٹھی اٹھائے، عورت بچہ اٹھائے!

مرد ـــــ طاقت!
عورت ـــــ تخلیق!!

وہ دیر تک مڑ مڑ کر اٹھیں دیکھتی رہی۔ موٹر نے ایک موڑ کاٹ لیا۔ وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہو گئے۔

اندو کو دھچکا سا لگا۔

الیس مسکرا دی۔ ـــــ اس کی بنائی الجھ گئی۔

ہر شخص کے پاس اون کا ایک گولہ ہوتا ہے۔ جس کی بنائی کے الجھاووں سے وہ اپنے مخصوص خیالات کا تانا بانا تیار کرتا رہتا ہے۔

بڈھا بومن اپنے حساب سے سوچتا ہے۔

اندو اپنے حساب سے سوچتی ہے۔

دونوں کی بنائی الگ الگ ہے۔

مگر اب اسے اس بات کو صاف کر لینا ہو گا۔

"کس بات کو!؟"

بڈھے بومن نے یکایک بگڑ کر پوچھا۔

وہ بھی جانتا تھا۔

وہ بھی جانتی تھی۔

فیصلہ کُن بات کرنے کا وقت آگیا ہے۔

بھیّی واپس پہنچ کر کھانا کھانے کے بعد وہ اس کے سامنے کافی روم میں بیٹھی تھی۔ نیچے غالیچے کے گدگدے دبیز فرش پر اس کی ماں بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے فالیچے کو کریدنے میں مصروف تھی۔

کمرے میں اس وقت ان تینوں کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ بومن بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

رات کی مدّھم مدّھم جھلاتی روشنیوں میں اسے بومن کا چہرہ بے حد پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ پراسرار اور کسی غیر معمولی طاقت کا خطرہ!

اُس کے سامنے پوری بات کیسے کہے؟!

دیر تک چپ رہی۔

"ہاں، ہاں، کہو!"

بومن نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے اُسے بات شروع کرنے کی ہمت بندھائی۔

"میں ایک لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں!"

قدرے توقف کے بعد بومن نے پوچھا۔

"رنجیت سے؟!"

اندو نے سر ہلا کر گردن جھکا لی۔

بومن نے پوچھا۔

"تم ایک کروڑپتی کی بیٹی ہو کر، بھیّی کی سب سے اونچی سوسائٹی میں ایک شہزادی کی طرح گھومنے والی میری لڑکی، میرے عملے کے ہی ایک معمولی ڈرائیور سے شادی کرو گی؟"

"یہ گلی ہے سلیٹھ!" کمی بائی دونوں ہاتھ چلا کر بولی۔ "بالکل گلی ہے۔ اس کی بات سنو ہی مت ستم۔ یہ اپنا بُرا بھلا سمجھتی ہی نہیں ہے۔ میں اس کی ماں ہوں، مجھ سے پوچھو!"

"تم سے کیا پوچھوں؟" بومن نے اُسے ڈپٹ کر کہا۔ "تم چُپ رہو!"

پھر وہ اندو کی طرف مڑ گیا۔ مگر اندو چُپ تھی۔

بہت دیر تک خاموشی رہی۔

ایسا لگا، جیسے یہ خاموشی ایک غبارے کی طرح پھولتی جا رہی ہے۔ پھولتی جا رہی ہے۔ سارے کمرے میں بھرتی جا رہی ہے۔

یکایک ایک بھیانک شور کے ساتھ یہ غبارہ پھٹ پڑے گا۔

اندو کی نگاہیں نیچی تھیں۔ اُسے معلوم تھا۔ بڈھا اسے عجیب نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ مگر جانے کیوں وہ آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی۔

اب بات کہہ دی تھی تو دل کا ڈر نکل گیا تھا۔ مگر غصہ اس بات کا تھا کہ بات کہنا کیوں پڑی؟

یہ چاہت بالکل اس کی اپنی تھی!

یوں تو ہر لڑکی محبت کرتی ہے۔ مگر یہ محبت تو بالکل اس کی اپنی تھی۔ اس کا اپنا ایک انگ تھا۔ قد تھا۔ موڈ تھا۔ لباس تھا۔ خوشبو تھی۔ ایسی جو بالکل اس کی اپنی طرح کی انوکھی اور سب سے الگ تھی۔ وہ کیوں اسے کسی دوسرے کو بتائے یا دکھانے پر مجبور کر دی جائے۔ اس دنیا میں جتنی لڑکیاں ہیں، اتنی ہی ان کی محبتیں ہیں۔ اس لئے اس دنیا میں محبت کا لفظ کبھی گھسا پٹا نہیں ہوتا۔ ہر نئی چاہت پر اس کا رنگ روپ بدل جاتا ہے۔ محبت کی اپنی حیا بھی ہوتی ہے۔

ایک دن کی چھوٹی سی شرم اور حیا جسے دوسرا ہاتھ بھی کیوں لگائے؟

کسی کو حق کیا پہنچتا ہے؟

بومن تو بومن وہ خود رجنیت کو اس کی پوری جھلک دکھانے کے لئے تیار نہ تھی۔

محبت تو خود ایک شوق ہے، جس کا گھونگھٹ میں لپٹا ہوا چہرہ کبھی کبھی یوں دکھائی دے

جاتا ہے۔

جیسے گہرے گہرے بادلوں میں دھنک کی رنگین قوس۔ مگر اب اس وقت وہ نازک چھوٹی چھوٹی چیز کو بومن سے بحث کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ اس کا اُسے غصہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بڈھا اُسے عجیب عجیب نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ مگر جانے کیوں وہ آنکھیں اٹھا کر کبھی اس کی طرف دیکھ نہیں سکتی ہے۔ ہاں! اسے معلوم ہے کہ غصے سے اس کا چہرہ لال ہوا جا رہا ہے۔

"کیا تم اُسے بھول نہیں سکتیں؟"

خلافِ توقع بومن کا لہجہ سخت نہیں ہوا

غصہ بھی اس کی آواز میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ اس کی آواز میں ایک گہری التجا، ایک عاجزی سمائی ہوئی تھی جو گویا ہاتھ جوڑے اندر سے کہہ رہی تھی۔

"اُسے بھلا دو نا!"

"اسے بھلا دو نا!!"

"نہیں! میں اُسے بھول نہیں سکتی؟!"

اندو نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر کہا۔

"کیا تم اُسے چھوڑ نہیں سکتیں؟!"

"نہیں" یکایک اندو نے سر اٹھا کر کہا۔ "آپ کی کوشش بے سود ہے سر بومن۔ مجھے اس سے الگ کر دینا۔

اس کا ٹیلیفون مجھ تک نہ پہنچنے دینا۔

مجھے کھنڈالے اور اسے سری نگر روانہ کر دینا تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں!

یہ کوشش بے کار ہے!! ——— میں اُسے نہیں چھوڑ سکتی، نہیں چھوڑ سکتی!"

یکایک اس کی ماں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی اپنی بیٹی کے پاس گئی۔ اور اسے زور سے جھنجھوڑ کر بولی۔

"دیوانی ہو گئی ہے۔ اس سیٹھ نے تجھے اپنی بیٹی بنایا ہے، اپنی کروڑوں کی جائیداد تجھے دینے والا ہے۔ اور تو اسے چھوڑ کر کسٹمر کا ہاتھ پکڑنے کو کہہ رہی ہے جو تجھے ایک ٹائم کی روٹی بھی نہیں دے سکتا۔ ہوش میں آ اندو!"

اندو نے اپنی ماں کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ اور الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

——— بہت دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔

جھلملاتی روشنی میں نیم تاریک آہوں کا دھواں شامل ہو گیا تھا۔ کمی بابو نے مڑ کر سیٹھ بومن سے کہا۔

"تم اس کی بات مت سنو سیٹھ!..... اس کو عقل نہیں ہے سیٹھ..... چھوکری ہے..... دنیا نہیں دیکھی ہے۔"

سیٹھ بومن پھر لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ناک والا میں سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے پوچھتا ہوں۔ اگر تمہیں یہ گھر چھوڑ دینا پڑے۔ یہ عیش و آرام یہ جائداد سب کچھ اپنے ہاتھ سے واپس دے کر پھر اسی گندے جھونپڑے میں جانا پڑے تو....."

"جب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گی۔" اندو نے بلا تامل فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

اور ———

اب جبکہ اس نے فیصلہ کر دیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مغرور نگاہوں سے بومن جی کی طرف دیکھا۔

اب اسے ایسے لگا جیسے کمرے کے دھندلے دھندلے نیم تاریک سائے دور

ہو گئے ہوں فضا میں مسرت کے ارغنون سے بجنے لگے ہوں۔
اندو کو لگا جیسے وہ ڈھلوانوں سے اترتی ہوئی، درختوں کی قطار کے ہمراہ بھاگتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" سربومن نے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز میں فولاد کی دھار تھی۔

"ہاں! آخری فیصلہ ہے۔"

اندو نے گرج کر کہا۔

"یہ سلیٹھ کیا سمجھتا ہے؟" اندو نے اپنے دل میں سوچا! کیا اس نے مجھے خرید لیا ہے؟!"

"نہیں.... نہیں سلیٹھ! یہ بچی ہے.... نا سمجھ ہے!!" کمتی بائی گھبرا کر بولی۔

"اس کی بات مت سنو!"

سربومن نے گھنٹی بجائی۔

سوسن سمجھ دار ہوئی۔

"رجنیت ڈرائیور ہے؟"

سربومن نے اس سے پوچھا۔

"ہے!"

"اس سے کہو فوراً گاڑی نکال کر باہر لے آئے۔ یہ لوگ ابھی واپس اپنی کھولی میں جائیں گے!!"

سوسن نے نگاہ اٹھا کر اندو کو دیکھا۔

اندو نے آنکھیں نہیں ملائیں۔

"واپس ـــــ!؟" سوسن حیرت سے بولی۔

"ہاں۔ ہاں۔ واپس واپس!" سربومن نے سختی سے کہا۔ "اس کا سامان باندھ دیا جائے اور انھیں ان کے پرانے کپڑوں اور سامان کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔ ابھی ـــــــ اسی وقت!!"

بڈھا بومن اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور

سوسن منہ کھولے ہوئے انڈ دکونا کتی رہ گئی۔

بارہ

رات کو اُسے کھولی میں واپس آنا۔ برا بھی نہیں لگا تھا۔ رات کے سناٹے میں، سیٹھ بومن کی آرام دہ گاڑی میں، نیند میں جھولتے ہوئے، اپنے رومانی فیصلے میں سرشار اندو کو ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی رشمی ہنڈولے میں بیٹھی ہوئی واپس اپنے گھر کو جا رہی ہے۔ نیند اس کی رگ و پے میں سمائی جا رہی تھی۔

جس وقت وہ جھونپڑی میں پہنچے تو لوگ رات کے سکوت میں پہلی نیند کا مزا لے رہے تھے۔

اس لئے ان کی آمد کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی۔

کھولی میں آتے ہی اندو کھٹیا پر پڑ کر سو گئی۔ کچھ دیر تک اُسے اپنی ماں کی دبی دبی سسکیوں کی آواز آتی رہی۔ جیسے دور کہیں دھوبی کپڑے دھو رہا ہو۔ پھر وہ آواز بھی پتھروں کی پن پناہٹ میں کھو گئی۔

پھر تیسرے پہر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کی الجھی لٹوں میں سرسرانے لگی۔ اور وہ پھر بے سدھ ہو گئی، کھٹیا پر پڑی پڑی سوتی رہی۔

تیسرے پہر کہیں کمی بائی کی بھی آنکھ لگ گئی۔ اس لئے صبح دم جب جھونپڑوں میں جھنکار ہوئی۔ اور کوؤں اور چڑیوں اور مرغوں کے ساتھ ساتھ جھونپڑے والے بھی جاگ اٹھے۔ اور رانی بالا نے اپنے بچھڑے ہوئے بدن کو انگڑائی لے کر جگہ جگہ سے توڑا۔

اور پھر ہاتھ میں پیتل کی گگریا لے کر نل پر چلی تو راستہ میں کمی بائی کا گھر کھلا دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر دروازہ کا پٹ کھلا دیکھ کر دبے پاؤں اندر چلی گئی۔ اور اندر وہ کمی بائی کو کھولی میں سوتے دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئی۔

پھر چند لمحوں کے سناٹے اور سکوت کے بعد چپکے سے لوٹ آئی۔ لوٹ آنے کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اپنی ماں سے کہہ دیا۔

ماں بھی دبے پاؤں کمی بائی کی کھولی میں اندر جا کے لوٹ آئی۔

پھر تو باری باری اڑوس پڑوس کی بہت سی بڑی بوڑھیوں، عورتوں، لڑکیوں، لڑکوں اور بچوں نے، دونوں ماں بیٹی کو سوتے دیکھ لیا۔

چند منٹوں میں ساری جھونپڑ پٹی میں یوں ماں بیٹی کے واپس آجانے پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

مگر دونوں ماں بیٹی ان چہ میگوئیاں سے بے خبر سو رہی تھیں۔

جب پچھم کے ایک پچھلے کونے سے دھوپ کا آڑا ترچھا کونا پھیل کر اندر کے کھپریل پر آیا۔ تو وہ کروٹ لے کر نیم مدہوشی میں بولی۔

"ارے سوسن ذرا بیڑی تو دینا"

کھس سے بہت سی چیخوں اور لڑکوں کی دبی دبی ہنسی کی آواز اس چھپر میں گونج گئی اور اس آواز کے ساتھ اندر ساڑھی کا پلو سنبھال کر اٹھ کر کھٹیا پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

یہ کون سی جگہ ہے؟
یہ کیسے اندھیرے ہیں یہ مٹیالے سے چہرے کن لوگوں کے ہیں؟
ہوا اس پر ہنستے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں!
یہ چھت ٹیڑھی کیوں ہے؟ اور اس پر فانوس کی جگہ مکڑی کے جالے کیوں لٹک رہے ہیں؟

اور اس کے نتھنوں میں ایک درجن بدبوئیں کہاں سے گھس پڑی ہیں؟ اندو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو اس کا ذہن بھی بیدار ہونے لگا۔ اور اسے کل پرسوں اور اس سے پہلے کے بیتے ہوئے چند ماہ کی باتیں، یاد آنے لگیں۔

راجی بالا آگے بڑھ کر بولی۔
"سرکار کو بیڈ ٹی چاہیئے؟"
چمپی بائی اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں سے ہنس کر بولی۔ "اور ناشتہ کس سے کریں گی آپ؟"
بھیکا بائی نے کہا۔
"ناشتے میں کیا لیں گی؟ انڈا۔ بھیجا۔ ٹوس۔ مکھن۔ کافی۔ مربہ....."
تابے اپنی خارش کو کھجاتا ہوا بولا۔
"کیا ہوا؟ سیٹھ نے نکال دیا؟"
"اور کیا؟" بھیکا بائی ناک پر انگلی رکھ کر ایک آنکھ میچ کر بولی۔ "پہلے بھگا لیا پھر جوتی کر آم کے چھوک کی طرح باہر کوڑے پر پھینک دیا۔"
سب عورتیں مرد زور زور سے ہنسنے لگے۔
ان کی ہنسی میں ایک عجیب طرح کی شمنی پائی جاتی تھی۔ حالانکہ وہ واپس آ گئی تھی مگر وہ دن وہ لوگ نہیں بھولے تھے جب وہ دونوں یہاں سے چلی گئی تھیں۔

وہ دن!

خوشیوں اور آرام کے دن لوگوں کو بھی یاد تھے حالاں کہ وہ دن، اور ان کی وہ خوشیاں انہوں نے نہیں بھوگی تھیں!

شائد اسی کا غصہ تھا ان لوگوں کے دل میں!

اس سلسلے میں اسی طرح کی دشمنی تھی جو اندو نے اس دن محسوس کی تھی جس دن وہ رنجیت کو ڈھونڈنے کے لئے جھونپڑپٹی کے قریب سے گذری تھی۔ اس دن جمیلی بائی، بھیکا، تامے، کوریا اور ان سب لوگوں کی نگاہوں میں لجاجت تھی، گھگھیاہٹ تھی، لیکن دست سوال دراز کرتے ہوئے، اپنے مطلب کی بات کہتے ہوئے کبھی ان نگاہوں میں اپنائیت نہیں تھی۔

بلکہ ایک رنگ آمیز دشمنی تھی۔

جو اس وقت تضحیک آمیز مخاصمت میں بدل چکی ہے۔

ہر سماجی گروہ کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔

ہم سطح غریبی اپنے سے نیچی سطح کو تو برداشت کرلے لیکن اپنے سے بلند تر سطح کو برداشت نہیں کرسکتی۔

'مجھے معاف کر دیتے میں ان لوگوں کو بہت وقت لگے گا'۔

اندو نے دل میں سوچا۔

مگر اسے بھیکا بائی کی بدکلامی پر غصہ تو بہت آیا تھا۔

مگر کیا کرتی؟!

زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

کمتی بائی بھی اب جاگ گئی تھی۔ مگر یوں واپس آنے پر کچھ اس قدر شرمسار تھی کہ وہ ان لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے میں نہیں پا رہی تھی۔ اس لئے وہ اٹھ کر

کسی سے بات کرنے کی بجائے کھٹیا پر منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ جیسے اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہو:

"تم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے، اب تم ہی بھگتو!"

رانی بالا نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"سرکار! غسل کا پانی تیار ہے!"

"اری مردار!" سبھیکا بائی اٹینشن کرتے ہوئے بولی: "نیا ڈریس بھی تو نکال دیا ہوتا آج کون سا ڈریس پہنے گیں آپ؟!"

رانی بالا نے پھر آگے بڑھ کے پوچھا۔ ایسے تیکھے تضحیک بھرے لہجے میں کہ اندو کے گال تمتما گئے۔

اس نے اٹھ کر تڑ سے ایک چانٹا رانی کے گال پر رسید کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ اسی لمحے رانی سے گتھم گتھا ہو گئی۔

پھر سب کے سامنے، اسی کھولی کے فرش پر دونوں نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کو الٹتی پلٹتی، نوچتی کھسوٹتی، بال کھینچتی اوپر تلے ہونے لگیں۔

بڑی مشکل سے بڑی بوڑھیوں نے مل کر، زور لگا کر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔

مگر اب بھی ــــ

وہ ہانپتی کانپتی، غصے میں بھری ہوئی، ایک دوسرے کے سامنے کھڑی بھتنیاں سی لگ رہی تھیں۔

ایک اچھی بات ہوئی تھی البتہ!

فرش پر مہینوں کی جمی ہوئی گرد صاف ہو گئی تھی۔ اور اب وہ سب انکے کپڑوں اور چہروں پر آ لگی تھی۔

کمی بائی نے جواب اپنی اندو کی صورت دیکھی تو ایکدم ہولا کے اٹھی اور اندو کو چونٹی

سے گھسیٹ کر نل پر نہلانے لگتی۔

مگر وہاں پہنچ کر اسے یاد آیا کہ جھونپڑوں کا نل تو صبح آٹھ بجے ہی بند ہو جاتا ہے۔ اب دن بھر بند رہے گا۔ اور اب دن بھر اندو اسی طرح گرد و خاک سا ڑھی میں لپٹی بنی بیٹھی رہے گی۔

کوریا نے ہوا میں ایک فرضی نل گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ سیٹھ بوسن کا باتھ روم نہیں ہے۔ ذرا سا گھمایا تو اوپر سے سادر سے سڑاں سڑاں پانی چالو ہو گیا۔ برسات کی طرح یہ جھونپڑپٹی کا نل ہے، مس صاحبہ؟! بھول گئیں، اتنی جلدی؟! رات کے نو بجے آئے گا!"

رما بائی بولی۔

"ہاں ذرا منہ دھونے کے لئے پانی چاہیئے تو....."

کہہ کر رما بائی نے اپنا لہنگا ذرا سا اٹھایا۔

"تو....."

کہہ کر رما بائی جو غلیظ اشارہ کرنے والی تھی اُسے پہلے ہی سے بھانپ کر کمی بائی ہاتھ اٹھا کر جو اس کی طرف بڑھی تو دبلی پتلی رما بائی بھاگ کر اپنی جھونپڑی میں گھس گئی۔

اندو غم اور غصے سے رونے لگی۔

"کیسے بد تہذیب ہیں یہ لوگ؟!

مگر ــــ

یہ لوگ تو وہی تھے جن کے درمیان وہ پلی بڑھی تھی۔ یہی ان کی باتیں تھیں اُن کے کھلے کھردرے غلیظ مذاق تھے۔

جنہیں وہ بچپن سے سنتی چلی آئی تھی۔

اس وقت اُسے اِن باتوں میں کوئی عیب دکھائی نہ دیا تھا۔

کوئی غلاظت نظر نہ آتی تھی۔

ان دنوں اُسے اس قسم کے مذاق پر ہنسی آجاتی تھی۔ جانے کیا ہو گیا ہے؟

اور کو روتی دھوتی چھوڑ کر کبھی بائی سیٹھ لاکھ چندانی کے بنگلے میں پہنچ جو چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

اس بنگلے کے باغیچے میں دو نل لگے ہوئے تھے۔ جن سے چوبیس گھنٹے پانی آتا تھا۔ سیٹھ اُتم چندانی نیک آدمی تھا۔ وہ اکثر سوکھے زمانے میں یا مصیبت کے زمانے میں، یا خاص خاص موقعوں پر جھونپڑے والوں کی عورتوں کو اپنے باغیچے کے نل سے پانی لینے یا کبھی کبھی نہانے کی اجازت دے دیتا تھا۔

اور پھر ——

اپنی بالکنی میں چھپ کر دوسری منزل سے نیچے باغیچے میں نہانے والی عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔

حالاں کہ ——

نہانے والی ننگی عورتیں نہاتے سمے ایک دوسرے کی آڑ میں نہاتی تھیں پھر بھی —— اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتے رہنے سے کچھ نہ کچھ تو پلے پڑ ہی جاتا ہے۔ سیٹھ چندانی بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔

جھونپڑے والے اسے بھلا نیک سمجھتے تھے۔ مگر اس کی نیکی کی اصلی وجہ کسی کو معلوم نہیں تھی!

اس دنیا میں کتنی ہی ایسی نیکیاں ہیں جن کے پیچھے بھیانک ہوسناکیاں چھپی رہتی ہیں!!

اور ——

کتنی ایسی برائیاں ہیں جو اندر سے فرشتوں کی طرح معصوم ہوتی ہیں!

سیٹھ چندانی کے بنگلے سے لوٹ کر کمتی بائی اندو کو کھولی سے اٹھا کر بنگلے کے باغیچے میں لے گئی۔

ذرا دور مالی کیاریوں میں کھرپی چلا رہا تھا۔

اندو کو لگا جیسے وہ بھی کنکھیوں سے اُسے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ سر پر قریب کے جامن کے پیڑ پر کوے اُسے دیکھ رہے تھے۔

نل کے نیچے کول تار کا ایک گندا ڈرم رکھا تھا جس کی تہہ پر کالی کیچڑ کی سطح پر کیچوے کلبلا رہے تھے۔

اندو کے پاؤں میں کیچڑ تھی۔ اور کہیں کہیں پر گھاس! اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کھاد کی سڑاند سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

بچپن سے اب تک سینکڑوں بار وہ اس نل پر نہا چکی تھی۔ پھر بھی اُسے آج یہاں کھلے میں نہانا عجیب سا لگ رہا تھا۔

ایسی بدبو کیوں؟!

نجانے اس کی ناک کو کیا ہو گیا ہے؟

جلدی جلدی نہاتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا تو اسے ایسے لگا، جیسے کونے کی بالکنی کے پردوں کے پیچھے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

اس نے گھبرا کر نظر نیچے کر لی۔ اور اپنے آپ میں اور بھی سمٹ گئی۔

نہانے کے بعد اس نے پھر وہی بدبودار کپڑے پہن لئے! مگر کیا کرتی رانی بالا نے اس کی ساڑھی کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

وہ ساڑھی پہن کر اندو کو ایسے لگا جیسے نہا دھو کر وہ پھر سے کیچڑ میں لوٹ لگا رہی ہو۔

ساڑھی پہن کر اس کا جی بری طرح متلانے لگا۔

دوپہر کو وہ اور اس کی ماں دونوں بھوکی رہیں!

گھر میں کچھ تھا ہی نہیں!!

اندو کو بھوک کبھی نہ لگی تھی۔ سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔

آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

دونوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ دونوں کروٹ بدل بدل کر اپنی اپنی کھٹیا پر پڑ کے لیٹی رہیں۔

مکھیاں بھنبھنائے جا رہی تھیں۔

مچھر کاٹے لیتے تھے۔

فرش پر کاکروچ چل رہے تھے۔

بیلے فرش کے ایک کنارے، دیوار کی گھسی پٹی چٹائی کو کاٹ کر، ایک چھوٹے سے سوراخ سے، ایک چھچھوندر اپنی تھوتھنی نکال کر اندر تک رہی تھی۔

چھچھوندر کو اتنے دنوں بعد اس کھولی میں سے اچھی سی باس آ رہی تھی۔ اور اندو اپنی جگہ پڑے پڑے سوچ رہی تھی۔

'اسے اب تک چھچھوندر کی بدبو کا اندازہ کیوں نہ ہوا تھا؟'

سہ پہر کے قریب اندو کو سخت بھوک لگی۔

کلائی کی طرف دیکھ کر اس نے گھڑی سے وقت کا اندازہ کرنا چاہا، مگر کلائی پر گھڑی کہاں تھی؟

کمی بائی بھی اٹھ بیٹھی۔

اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر بھانپ گئی۔ جلدی سے باہر نکل گئی۔ نکڑ کے ایرانی سے آدھا پرات کی باسی دال ایک کٹورے میں اور چند چھچھوندر لگے پلے سے سلائس لے کر آئی۔ اور اپنی بیٹی کے سامنے رکھ کر کھانے لگی۔

اندو نے اٹھ لیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے [illegible] نے بھی سب کچھ تو کھایا تھا۔

آج اُسے کیا ہو گیا ہے؟

نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ پانی کا ایک بڑا گھونٹ پی [illegible] نوالہ نیچے اُتارا۔ پھر سالن کے دوسرے ٹکڑے کو جھاڑ کے دال میں ڈبو کے کھانے لگی۔ تو جلدی سے منہ موڑ کر اس نے وہیں کھٹیا سے نیچے تھوک دی۔

کمی بائی مسکرانے لگی۔

بڑے اطمینان سے اس نے اپنا کھانا ختم کیا۔

پھر کٹورا اٹھا کر کے قرینے سے ایک طرف برتن نکال کے بولی۔

"رنجیت سے کس وقت ملنے کا وعدہ ہے، دوپہر کو آیا تھا نا!"

"شام کے سات بجے ملنے کو کہا ہے!"

"کہاں پر؟"

"میرین ڈرائیو پر!"

"وہ تمہیں لینے کے لئے آئے گا؟"

"نہیں میں نے کہہ دیا تھا۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"تم جاؤ گی؟"

اندو نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جاؤ گی؟"

کمی بائی نے کڑک کر پوچھا۔

اندو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹیا کی پٹی سے لگے لگے رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت تھی۔

جیسے کسی بھیانک بھوت خانے میں آ گئی ہو۔
بار بار گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی تھی اور پھر سر جھکا کر رو دیتی تھی۔
اندر کو رتا چھوڑ کر کمی بائی چپ چاپ وہاں سے کھسک گئی۔
ایرانی کے ہوٹل میں پہنچ کر اس نے ساڑھی کے پلو سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور کونٹر پر کھڑے ایرانی کو دے کر بولی۔
"مہربان جی! اس نمبر پر ٹیلی فون کر دیو۔"
ایرانی نے چند منٹ توقف کے بعد کاغذ سے فارغ ہو کر نمبر ملا دیا اور ٹیلیفون کے چونگے کو ایک کونے میں کر کے ہاتھ میں دے دیا۔
کمی بائی نے کچھ کہا۔
جس کے جواب میں ادھر سے کسی نے اسے ٹھہر جانے کو کہا۔ کچھ دیر تک کمی بائی چپ کھڑی رہی۔
اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔
آخر ادھر سے اس نے وہی پرانی جانی پہچانی آواز سنی اور اس نے گھبرا کر کہا۔
"سیٹھ؟"
"ہاں!"
"میں کمی بائی بولتی ہے!"
"بولو؟"
"سیٹھ! تم نے تو تین دن دیئے تھے۔ پر وہ تو ایک ہی دن میں غلاظت ہو گئی۔"
"ایسا؟"
کہہ کر ادھر سے کوئی زور زور سے ہنسنے لگا۔

پھر رک کر بولی۔

"تو اب کیا بولتی ہے؟"

"کچھ نہیں بولتی۔ بس روئے جاتی ہے۔"

اُدھر سے پھر ہنسی کی آواز آئی۔ ہنسی روک کر سیٹھ بومن نے کہا: "اچھا تو میں ابھی گاڑی بھیجتا ہوں۔ اُسے واپس لے آؤ!"

انارو الہ دین کے محل میں واپس آگئی۔

سر بومن کو پورا یقین تھا کہ وہ واپس آجائے گی۔ ایک طرح سے وہ خود بھی چاہتا تھا کہ انارو ایک بار واپس جانے کا تجربہ کر لے۔

اس نے کرسٹ جی سے کہا۔

"مجھے معلوم تھا، وہ وہاں نہیں رہ سکے گی۔ چند ماہ میں، میں نے یہاں جس عیش و آرام میں رہنے کی تربیت دیدی ہے۔ اس کے بعد..... اس کے بعد تو....."

وہ کرسٹ جی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"جی ہاں۔ اس کے بعد تو یہی ہوتا، جو ہوا۔"

کرسٹ جی نے فقرہ پورا کیا۔

سوچنے لگا کہ

"الہ دین کا قصہ آج بھی اسی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ کہانی آج بھی زندہ ہے۔ الہ دین کا محل آج بھی موجود ہیں۔ الہ دین کا جن آج بھی کھنا پیر بیڈ یا اولڈن موڈ یا ملبار ہل کے سیٹھ کے تابع ہے۔ جن کے ایک اشارے پر مہالکشمی کی جھونپڑ پٹی سے ایک درزی کی بیٹی آج بھی اٹھا کر شاہی محلوں کی طرح سجے سجائے دیوانوں میں لائی جاتی ہے۔ اور ان دونوں زندگیوں میں، مہالکشمی کی کھولی میں اور نپین سی روڈ کے آٹھ بیڈ روم

والے فلیٹ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا الہ دین درزی کے بیٹے کی کھولی میں اور بادشاہ کے محل میں آج سے دو ہزار سال پہلے فرق تھا۔

کچھ بدلا نہیں ہے۔

چند ظاہری لوازمات بدل گئے ہیں۔ آج چراغ کی جگہ بٹن دبایا جاتا ہے۔ اور درجنوں غلام ماڈرن جنوں کی صورت میں دست بستہ حکم کی تعمیل بجا لانے کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں۔

محل میں واپس آجانے کے بعد اندو کی ملاقات بڈھے ہومن سے اب تک نہیں ہوئی تھی۔

چالاک بڈھا فوراً ہی اندو کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اسے وقت دینا چاہتا تھا کہ وہ پھر سے نئے ماحول میں رچ بس جائے۔ وہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اندو بھی فوراً ہی اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔

اچھا ہی ہوا جو دن بھر وہ اندو کے سامنے نہیں آیا۔ رات کے کھانے کے بعد البتہ اس نے کہلوا دیا تھا کہ وہ کافی پینے کے لئے اندو کے کمرے میں آئے گا۔

گلابی لیس والی نائیلان کی نائٹی پہنے اندو نیم دراز حالت میں اپنے بستر پڑی اس کھولی کا اندازہ کر رہی تھی۔ جہاں ایک دن کے لئے اسے واپس جانا پڑا تھا۔ جہاں کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں جھرجھری سی آجاتی تھی۔

آنکھیں موند کے اس نے اس غلیظ کھولی کے تصور کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ پھر آنکھیں کھول کر اس نے اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھا۔ اور گویا اسے اپنی آنکھوں میں بھر کر سیدھے سیدھے شفاف بستر پر لیٹ گئی۔

تہہ در تہہ بلور فوم ابرو کے نیچے فولادی اسپرنگ اس کے جسم کی ذرا سی حرکت

سے ملتے تھے

اور ــــ

اُسے جھولے کی سی کیفیت سے دوچار کر دیتے تھے۔

یوں چپکے لیٹے رہنے میں کتنا مزا ہے۔

مدھم مدھم نیلی روشنیاں آنکھوں کے پھولدار دال پر ریشمی ہیولے بُن رہی تھیں۔

زبان پر تازہ بھنی ہوئی کافی کا مزا ہے۔

دیسی نائٹی کی ہر سلوٹ شفاف مرمریں بدن کے ہر خم کو چھو کر بوسے کا سا مزا دیتی ہے۔

کتنا آرام دہ سکون ہے اس ایرکنڈیشنڈ کمرے میں۔ اندو نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

مدھم مدھم موسیقی سٹیریو فونک ریکارڈ و گرام سے پھوار کی طرح اس کے سارے بدن پر برس رہی ہے۔ ہلکے ہلکے سروں کی بوندیاں اس کے جسم کو سہلاتے ہوئے ایک غنودگی آمیز نشے کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں۔

اندو کے پپوٹے بوجھل ہو چلے تھے۔

اُسے اپنا سارا بدن موسیقی کے بھنور میں تیرتا گھومتا معلوم ہوتا ہے۔

"اپنی آنکھیں مت کھولو۔"

کسی نے بالکل اس کے قریب آکر کہا۔

یہ سربومن کی آواز تھی۔

میٹھی سرگوشی کی طرح سرسراتی ہوئی۔

اُسے گویا تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

اور ——

آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"بہت سال گذرے۔

بہت سال گذرے۔

جب میں بیاسی برس کا نہیں تھا۔

جب تمہاری طرح انیس برس کا بھی نہیں تھا۔

جب میں صرف پانچ برس کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔

جب بمبئی میں بڑے زور کی پلیگ پھیلی تھی۔ جس میں میرے سوا میرے کل خاندان کا صفایا ہو گیا تھا۔

ان دنوں میری آیا، جس نے مجھے بچپن سے پالا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر بمبئی سے باہر بھاگ کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔ اور پھر کئی ماہ بعد، پلیگ ختم ہونے کے بعد مجھے بمبئی واپس لائی تھی۔

مگر اب میں بالکل یتیم تھا۔

بے سہارا۔ غریب نادار۔

میں اپنی آیا کے ساتھ اس کی کھولی میں رہتا تھا۔ وہ بے چاری دن بھر ملازمت کرتی تھی اور مجھے کھلاتی تھی۔

جس پارسی سیٹھ کے ہاں وہ کام کرتی تھی۔ اسی سیٹھ نے میری آیا سے میری دردبھری کہانی سن کر مجھے گود لینے کا فیصلہ کر لیا۔

اور آج،

جو تم مجھے اس قدر امیر و کبیر دیکھتی ہو، اس میں سب سے بڑا ہاتھ میرے اُس

محسن کا ہے۔ جس نے ایک یتیم بچے کو سڑک سے اٹھا کر لکھ پتی بنا دیا۔ اور جو چالیس اس سیٹھ نے مجھے دیا۔

وہی چالیس! ـــــ میں نے بھی ایک بوتل میں بند کر کے سمندر کے حوالے کر دیا مگر میرا جی چاہتا تھا کہ یہ بوتل کسی امیر آدمی کو نہ ملے ملے تو کسی ایسی لڑکی کو ملے جسے میں اپنی مرحوم بیٹی کی جگہ دے سکوں۔

جو میری اسی بیٹی کی طرح اطاعت گذار اور فرماں بردار ہو!

ایک ایسی لڑکی، جس نے اپنی زندگی صفر سے شروع کی ہو اور اس بات کی اہمیت سمجھ سکے کہ وہ کس کی وارث ہونے جا رہی ہے؟

کوئی ایک ایسی لڑکی!

جو مجھے میری مرحوم بچی کی مسرت دے سکے۔

جس کو میں فخر سے اپنی بیٹی کہہ سکوں۔

معلوم نہیں اندو تم کیا سمجھ رہی ہو؟

میں کیا کہہ رہی ہوں؟؟"

اندو کے ماتھے پر آنسو کی ایک بوند گری۔

اندو نے آنکھیں کھول دیں۔ بومن کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر اس کا دل پگھلنے لگا۔

اس نے بستر سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر دئے اور اپنا منہ اس کے سینے میں چھپا کر بولی۔

"وہ تمہیں کیا کہتی تھی؟"

"پاپا!"

"تو میں بھی تمہیں آج سے پاپا کہوں گی" اندو سسک سسک کر بولی "باپ کا پیار

تو مجھے کبھی نہیں ملا..... مگر آج۔ تمہارے سینے سے لگ کر معلوم ہوتا ہے ..... پپا۔ پپا.... سچ سچ تم میرے پپا ہو....."

بومن نے زور سے اندو کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

رات کو تھکا ہارا، تین گھنٹے انتظار کرنے کے بعد جب رنجیت اندو کی کھولی کے باہر پہنچا، تو کھولی کو خالی دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

"چڑیا اڑ گئی!"

بڑھی بھیکا بائی اپنے بیٹھے ہوئے گلے سے تضحیک آمیز لہجے میں بولی۔

"کدھر گئی؟"

"جدھر سے آئی تھی۔ اُدھر ہی گئی"۔ چمپی بائی بولی "وہیں سونے کے پنجرے میں!"

جھونپڑ پٹی سے باہر نکلا تو اسے رانی بالا بچھوے بجاتی ہوئی مل گئی۔ بالکل اس کے قریب آکر بولی۔

"اس کا دھیان چھوڑ دو بابو! دنیا میں اور بھی لڑکیاں ہیں!"

رانی بالا اُس کے اس قدر قریب آگئی تھی۔ اور یوں ترچھی کھڑی تھی کہ اُس کے اُبھرے ہوئے سینے کی نوک اس کی چھاتی میں گڑ گئی تھی۔

وہ ذرا پیچھے ہٹا،

تو وہ پھر آگے آگئی۔

اپنی گرم گرم سانسیں اس کے رخسار پر چھوڑتی ہوئی بولی۔

"بجو ——!!"

اس کی سانسیں جیسے دھیرے دھیرے اس کے رخسار سے لپٹ کر پیار کر رہی

تھی ــــ

سالینی کی بھی انگلیاں ہوتی ہیں۔

یہ اُسے ابھی معلوم ہوا۔

"رنجو! تم مجھ سے بھاگ نہیں سکتے۔ مجھے معلوم ہے اندر سے پیار کرتے ہو۔ کبھی کبھی جب تمہاری نگاہ مجھ پر پڑ جاتی تھی تو بس وہیں کی وہیں ٹھہر جاتی تھی۔ میں اپنے بدن کا زہر پہچانتی ہوں۔

رنجو!

ایک دفعہ قریب آ گئے تو پھر سات دن تک ہوش میں نہیں آ سکو گے۔"

رنجیت نے گھوم جانے کی کوشش کی تو رانی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر جیسے بجلی کے کرنٹ نے اُسے چھو لیا ہو۔

"ہاں میں ایسی ہی ہوں!" رانی بالا اس کی بے بسی سمجھ کر ہنسی "پھر میں آوارہ بھی ہوں۔

گندی ہوں۔

پر ہوں نہیں!

گوری کا جوبن چکھنے میں گیا۔

میری ماں نے بچپن ہی سے مجھے خبردار کر دیا تھا۔ اس لئے..... میں نے ..... ہاں..... میں نے سب کچھ سمیٹ کے، سنبھال کے رکھا ہے..... کسی ایک کے لئے!

تم نہیں مانو گے رنجو!!" رانی نے ہونٹ کے ایک کونے کو دانتوں سے دبا کر ہلکی سی سسکی لی۔ "یقین نہیں کرو گے نا؟ ــــ مگر یقین نہ کرتے ہوئے میرے ہی پاس آؤ گے!!"

رنجیت کچھ نہیں بولا۔
رانی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایکدم گھوم کر اپنے گھر کی طرف چلنے لگی۔ رنجیت وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔
چلتے چلتے رانی رک کر پلٹی۔
ترچھی نگاہوں سے گردن ٹیڑھی کر کے اس کی طرف دیکھا۔ زور سے ہنس دی۔

پھر ——
ہرنی کی طرح قلانچ بھر کر جھونپڑپٹی کے ایک گلیارے میں غائب ہو گئی۔
مگر رخسار پر اس کی گرم گرم سانس کا لمس، ابھی تک باقی تھا۔
اور وہ لمس!
دھیرے دھیرے اس سے سرگوشی کر رہا تھا۔

بومن نے اندو سے کہا۔
"کل میں تمہارے نام سے بنک میں ایکاؤنٹ کھول دوں گا۔ ہر مہینے تمہیں دس ہزار روپیہ جیب خرچ ملا کرے گا۔"
"او پاپا!"
اندو خوشی سے چلائی۔
اس نے بڈھے بومن کا کان چوم لیا۔
"اور اگلے چار ماہ ہم مختلف ہل سٹیشنوں پر گزاریں گے پہلے کشمیر چلیں گے۔ واپسی پر مسوری۔

وہاں سے فیصلہ۔

وہاں سے نینی تال۔

تمہارا تربیتی عملہ تمہارے ساتھ چلے گا۔ چار ماہ کے بعد واپسی پر بمبئی پہنچ کر میں تمہارے آنر میں ایک شاندار پارٹی دوں گا۔ جس میں، میں تمہارا تعارف اپنی بیٹی کی حیثیت سے کراؤں گا!"

اب!

اندو نے بومن کے دائیں گال پر بوسہ دیا۔ کیوں کہ اس نے فلموں میں دیکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اندو کے دل میں شکر گذاری کا جذبہ نہیں تھا۔ وہ تو موجود تھا۔ مگر اس کے اظہار کے طریقے تو باہر کی دنیا سے سیکھے جاتے ہیں نا ——!؟

اندو اب نچلے سماج کے اظہار کے طریقے چھوڑ کر اوپر کے سماج کے طریقے اپنا رہی تھی۔

زندہ رہنے کا یہ اصول بہت پرانا ہے کہ فرد جس ماحول میں رہے، وہیں کے طریقے اپنائے!

فرض کر لو کہ ——

سر بومن نے اندو کو قطعی طور پر آخری بار —— اور واقعی سچ مچ اپنے گھر سے نکال کر واپس نہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہوتا، تو اس صورت میں آج نہیں تو کل کل نہیں تو دس دن بعد اندو کو پھر سے اپنے اسی پرانے سماج، اور اسی جھونپڑ پٹی کے طور طریقوں پر عمل کرنا پڑتا، کیوں کہ فرد صرف چند مخصوص حیوانی اظہار کے طریقے ہی لے کر پیدا ہوتا ہے، باقی سب ماحول سے، ماحول سے مابقت یا مطابقت پیدا

کرنے کے لئے سیکھتا ہے۔

بومن خوش تھا کہ اندو نے نچلے سماج کی کینچلی اتار پھینکی تھی۔ اور نئے ماحول سے زندگی کے طور طریقے سیکھ رہی تھی۔

"تمہارے مزاج میں ایک سختی اور پتھریلا پن ہے، جو مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے کیا، سبھی عورتوں کو مردوں کی یہی خصلت سب سے زیادہ پسند آتی ہے۔ اندو کو بھی یہی پسند آئی ہوگی۔ کیا اس نے کبھی تم سے اس کا ذکر کیا؟!"

"نہیں!"

رنجیت کے منہ سے ایک ہلکی سی آہ نکلی۔

بہت جلدی اس نے اُسے دبا دیا ـــــ کہیں رانی بالا اُسے محسوس نہ کرلے!

"مگر میں ہمیشہ محسوس کرلیتی ہوں!" رانی بالا آہستہ سے بولی۔ "جب کبھی اندو کا نام آتا ہے۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھا ہوا یا کمر پر پڑا ہوا ہمیشہ ذرا سا ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

جلد کی گرمی بھی کم ہو جاتی ہے۔

عورتوں کے پاس اپنے طریقے ہیں، مردوں کے دل کے اندر جھانکنے کے لئے! عورت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ مرد کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ سنے! وہ ایک بوسے سے بھی بہت کچھ معلوم کرسکتی ہے۔"

رانی بالا نے اپنے ہونٹ آگے بڑھا دیئے۔ رنجیت نے اسے اپنی باہنوں میں بھر لیا۔

مگر وہ باہنوں میں بھرنے کے بعد بھی، باہنوں سے باہر چھلک رہی تھی اور ایک منہ

زور تند خو سرکش گھوڑی کی طرح ایک لمبے سفر پر جانے کے لئے بیتاب تھی۔ رنجیت نے بہت دیر تک اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کئے رکھے۔

آخر اس نے ایکدم ہونٹ ہٹا کے، اپنی دونوں باہیں کھول دیں۔ رانی بالا کا بدن سمندر کی ریت پر گر گیا۔

اور کسمساتی ہوئی لہروں کی طرح ٹوٹنے لگا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

رنجیت نے اس سے پوچھا۔

"ابھی ــــ! اسی دم ــــ!!"

رانی چیخ کر بولی۔

اور پھر!

اس کی باہنوں میں آ گئی۔ اور زبردستی اس کی باہنوں میں بھرنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ؟" رنجیت نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔ "مجھ سے شادی کیوں کرو گی؟"

"تمہیں کھا جانے کے لئے!"

رانی نے فاتحانہ کر کہا۔

اور ــــ

لمبے لمبے سانس لے کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملانے لگی۔ رنجیت نے نرمی سے منہ ذرا پرے کر لیا۔

بولا۔

"رانی کیا مجھ سے وفادار رہ سکو گی؟"

"تو کیا اس بڈھے سے رہوں گی جو میرے جسم کے اب دس ہزار دیتا ہے؟!"

رانی بالا اس کے گال پر چٹکی لے کر بولی۔

"میرے رنجو! تمہیں معلوم نہیں ہے شاید کہ عورتیں کبھی وفادار نہیں ہوتیں۔ عورتیں وفادار رکھی جاتی ہیں۔

اور یہ کام ـــــ صرف مرد کر سکتا ہے!

میں نے بہت سے مردوں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ پھر انہیں نامنظور کر دیا۔"

رانی بالا نے یہ کہہ کر، ایک انگلی سے سمندر کی ریت پر ایک لمبی سی نامنظوری کی لکیر کھینچ دی۔

دور تک کھینچ دی۔

حتیٰ کہ اس کا جسم کمان کی طرح خمیدہ ہو کے تن گیا۔ رنجیت آتش نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

رنجیت اُسے یہاں نہیں لایا تھا۔

وہ اُسے یہاں لے کے آئی تھی۔

جو ہو سے آگے ـــــ جہاں وارسوا اور جوہو کے ساحل ملتے ہیں۔ ایک ترچھا، ٹیڑھا، ناریل کے پیڑوں سے گھرا ہوا،

نظروں سے دُور،

ایک چھوٹا سا سنگ ناسا ساحل ہے۔

جس کی ریت بالکل دودھیا ہے۔ اور جو شام کے بعد اس قدر خطرناک سمجھا جاتا ہے کہ چہل قدمی کے لئے بہت کم لوگ اِدھر آتے ہیں۔ اس لئے شام کے بعد یہ جگہ بیحد سنسان رہتی ہے۔

رنجیت نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر، زور سے اس کی کمر پر رکھ دیئے۔ رانی

تڑپ کر بولی۔

مگر ــــ

رنجیت کی فولادی گرفت سے باہر نہ نکل سکی۔

"مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو!"

کہہ کر، رانی نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر دو تین چانٹے تڑاتڑ رنجیت کے منہ پر رسید کئے۔

مگر رنجیت کو ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔

اس کی گردن غرور سے تن گئی!

اس نے دونوں ہاتھ ہٹائے بغیر وہیں سے جو ایک جھٹکا دیا تو رانی بالا کا جسم اس کے سینے سے آن لگا۔

رانی بالا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں میں گڑو کر ایک زہریلی سرگوشی میں کہا۔

"مجھے چھوڑ دو!

کمینے سور!.....

حرامزادے!.....

پلید! مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو!"

رنجیت کو اپنے شانوں میں ایک تیز کھرونچ کا احساس ہوا۔ اس نے فاتحانہ انداز سے ہنس کر اپنے کندھوں کو باری باری دیکھا۔

جہاں سے لہو کی اب ایک لکیر پھوٹ رہی تھی۔

اس نے ایک ہاتھ ہٹا کر رانی بالا کے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے اپنی مٹھی میں لئے۔ رانی پوری قوت لگا کر اس گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کو شش

میں اس کا بدن دُہرا ہو کر رجنیت کی گود میں جا گرا۔

اور ——

رجنیت ہنس کر اس کے بدن پر جھکتا گیا۔ اور وہ ایک بے بس مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر کہنے لگی۔

"مجھے چھوڑ دو!

مجھے چھوڑ دو!!

مجھے مت چھوو!!!

مجھے چھوڑ دو، مجھے مت ....."

پھر!

ناریل کے بہت سے ہرے ہرے پنکھ ہوا میں جھول کر رجنیت کے کانوں میں شور مچانے لگے۔

اور رانی بالا کے آنکھوں میں دُودھیا ریت بکھر گئی۔

چار ماہ کی سیر و سیاحت اور سیر و سیاحت کے دوران میں اعلیٰ تربیت کے بعد اندو کی تہذیب بھی نرالی ہو چلی تھی۔

اس کی بات چیت،

چال ڈھال،

وضع قطع،

رکھ رکھاؤ میں ایک اعلیٰ شجرے کی، اعلیٰ خاندان کی آزاد، مغرب زدہ، مغنائے فیشن کی دلدادہ لڑکی کے انداز آ گئے تھے۔ اور ذہن میں وہ خود اعتمادی، جو معقول خاندان

کی لڑکیوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

اب!

اُسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی کھولی سے اٹھ کر آئی تھی!

لگتا تھا۔

جیسے اس نے آج تک ایسی کسی زندگی کی جھلک تک نہیں دیکھی ہے۔ اس حد تک اس پر محنت کی گئی تھی۔ اور ابھی تو وہ اور نکھرے گی دن پر دن.....

انسان بھی محنت اور جلا سے چمکتا ہے۔

صرف اندرونی فطانت ہی سب کچھ نہیں!

یہ تمام صلاحیتیں اس کے اندر پہلے سے موجود تھیں۔ مگر کھولی کی کبڑی تاریک چھت نے اس کے ذہن کے آسمان کو بالکل ہی محدود کر دیا تھا۔ آسمان صرف وہ نہیں ہوتا جو کھلے میں نظر آتا ہے۔

آسمان وہ بھی ہوتا ہے، جو چھت کے نیچے پایا جاتا ہے، جو دیواروں پر مکڑی کی طرح سرکتا ہے،

فرش پر کیڑے کی طرح چلتا ہے،

اور ــــ

بھوک بن کر خالی آنتوں میں رینگتا ہے۔

اندر کے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ فن اور فیشن (FUN AND FASHION) میگزین کے اوراق الٹتے ہوئے، نئے لباس کے ڈیزائن دیکھتے ہوئے، اس کا دماغ کدھر بھٹک گیا تھا۔

نتازلی کے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر وہ جلدی سے اٹھی۔ اور اس نے اپنے منہ کا مزا بدلنے کے لئے، اپنے لئے، جلدی سے ایک مارٹینی بنائی۔ حالاں کہ ابھی ٹھیک سے

شام ہوئی نہیں تھی۔ اور شام کی دعوت میں جو مہمان آنے والے تھے، وہ ابھی نہیں آئے تھے پھر بھی ——

اس کھولی کا دھیان آتے ہی اُسے ایک مارٹینی کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ جیسے کچھ لوگوں کو جہنم کا خیال آتے ہی خدا کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بے چارا خدا —— !

انسانوں کی دنیا میں وہ کبھی چاہا نہیں گیا۔

اسے ہمیشہ ایک کھونٹی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

'اونہہ۔ کیسے کیسے خیال اس کے ذہن میں آرہے ہیں!'

مارٹینی کے گھونٹ کچھ دیر زبان پر رکھ کر اس نے اس کے مزے کو پرکھا پھر گھونٹ مسکرا کر گلے سے نیچے اُتار لیا۔

'اچھا ہے!'

اس نے سوچا۔

اور ——

یاقوت رنگ مارٹینی کے جام کو اٹھا کر روشنی میں دیکھنے لگی۔ جام میں برف کے ٹکڑے کیسے اجنبی سے لگ رہے تھے۔

کل مصرانی کی طرح!

دیکھنے میں کل بھی ان ہی برف کے ٹکڑوں کی طرح سفید تھا۔ اور اس کے جسم میں دل کی جگہ بھی شاید برف کا ایک ٹکڑا ہی تھا۔

مگر اس کے لئے وہ کل مصرانی کو زیادہ مستوجب قرار نہیں دے سکتی تھی۔ وہ خود کیا تھی؟

جو وہ تھی —— وہی تو کل مصرانی بھی تھا

اور دوسرے بھی ـــــــــ ایسے ہی تھے۔ جو اُسے بمبئی کی امیر ترین لڑکی سمجھ کر اُس کے اِرد گرد گھومتے تھے۔

یہ سب لوگ ایک ہی نظامِ شمسی کا حصّہ تھے۔ جہاں ہر سیارے کا ایک زمان ہوتا ہے ـــ

جنم ہوتا ہے،

مرنا ہوتا ہے،

جوان ہوتا ہے،

اور باہمی کشش کا بھی ایک توازن ہوتا ہے۔ اور بس یوں ہی ہے ہر جگہ۔ اوپر کی زندگی میں!

اور اس سے بھی نیچے جا کر کھولی کی زندگی میں!!

ہر چھوٹے سے چھوٹا نظامِ حیات کے اندر رہنے!

قاعدے قانون، رسم و رواج، نقل و حرکت اور انداز فکر کی طنابوں سے بندھی ہوئی زندگیوں کے سیارے ہیں،

جنہیں ہم فرد کہتے ہیں!

قوم کہتے ہیں!!

انسان کہتے ہیں!!!

اور کہتے ہیں آزاد ـــــــ اور قائم بالذات کہتے ہیں، مگر دراصل کتنے آزاد ہیں ہم؟

یوں کہنے کو تو سورج بھی آزاد ہے اور زمین بھی! ـــــ لیکن کسی نے سورج اور زمین کے درمیان اس نازک، لیکن سب سے مضبوط رشتے کو محسوس نہیں کیا ہے۔ جس سے زمین، سورج سے اور سورج زمین سے بندھا ہوا ہے۔

"مس اندو بومن۔ ایک گھونٹ اور اس آتشِ سیال کا لو۔ کش شارلی کے سگرٹ کا اور لو!

اس کی منقول کی مہک کو اپنے پتلے پتلے سیپ کی طرح نازک نتھنوں سے باہر نکالو۔ اور فضول، غیر اہم اور بے کار خیالات کو چھوڑ کر آج کی شام میں آنے والے مہمانوں کی فہرست پر نگاہ ڈالو۔ جو ابھی ابھی سوسن ٹائپ کر کے تمہیں دے گئی ہے۔

پہلا نام کمل مصرانی کا تھا۔

"کمبخت یہ کمل مصرانی یہاں بھی آ ٹپکا!"

کمل مصرانی سے اندو کی ملاقات کھلن مرگ سے الپتھر جاتے ہوئے ہو گئی تھی۔ سر بومن تو نیچے گلمرگ ہی میں رہ گیا تھا۔

کرسٹ جی نے کھلن مرگ تک جانے کی ہمت کی تھی۔ اس کے بعد اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔

کیوں کہ ——

وہ بظاہر تندرست اور توانا دکھائی دینے کے باوجود پرانے دمہ کا مریض تھا۔ اور اندو الپتھر کی جھیل کے اتنے قریب آ کر اُسے دیکھے بغیر واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ سوسن کو کرسٹ جی کی نگہداشت سونپ کر خود اوپر کی گھاٹی پر چڑھتی چلی گئی۔

جوں جوں وہ اوپر جا رہی تھی۔ برف گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر جگہوں پر برف ولایت کے کہرے کی وجہ سے کانچ کی طرح سخت اور پھسلواں ہو چکی تھی۔ اس لئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔

ہر پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اندو کو رک جانا پڑتا اور وہ اپنی مضبوط چھڑی کی فولادی دم کی نوک کو برف میں گاڑ کر سانس لینے لگتی۔

اور نیچے کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس کے پیچھے کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر ایک بھدا سپید دھرے بدن کا چھ فٹ کا اونچا نوجوان نیلے رنگ کا سپلوٹس سوئٹر پہنے ہانپتا چلا آرہا تھا۔

جہاں اندو کے قدم رکتے

وہ بھی وہیں دو سو فٹ کے فاصلے پر نیچے اپنے قدم روک کر اندو کے خوب صورت جسم کو پیچھے سے تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔

اندو اپنی پشت کی جلد پر اس کی نگاہوں کی گرمی محسوس کر سکتی تھی۔ مگر وہ بھدا سپید بلکہ دودھیا قسم کا آدمی بے حد مودب تھا۔ اور اپنے اور اندو کے درمیان ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ ہمیشہ رکھتا تھا۔

کھلن مرگ کی گھاٹی ایک ڈھلوان میں غائب ہو چکی تھی۔ نیچے قدموں میں گل مرگ کے کاٹیج،

گاف کورس،

اور پھولوں کے چمن زار خوشنما رنگ اور شوخ دھبوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ چاروں طرف ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں کسی مضبوط قلعے کی برجیوں کی طرح ایستادہ تھیں۔

جن میں اندو خود کو تنہا محسوس کرنے لگی۔

اب چند قدم پر پتھر کی تھیلی تھی۔

اندو نے برف میں گڑی ہوئی چھڑی نکال کر آگے گھاٹی پر ایک قدم لیا کہ اس کا قدم پھسل گیا۔

اور وہ نیچے کو پھسلتے پھسلتے اپنا توازن بالکل کھو بیٹھی۔ اور خوف کی ایک تیز چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

مگر پیچھے آنے والے نوجوان نے آگے بڑھ کر اندو کو باہیں پھیلا کر سنبھالا۔ اندو اس دور سے نیچے کی طرف جا رہی تھی کہ اگر اس نوجوان کے پیچھے ایک بھاری چٹان نہ ہوتی تو اس کے قدم بھی اکھڑ گئے ہوتے۔

اب اندو اس نوجوان کی باہوں میں تھی۔

دونوں جسموں کی بھاری ٹکر اس زور کی تھی کہ ابھی نوجوان کا جسم اندو کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بھی پیچھے کی چٹان پر بقریباً بچھ سا گیا۔ ممکن ہے اس کی پشت کو کچھ چوٹ بھی آئی ہو۔

مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

اگلے چند لمحوں میں کچھ وہ سنبھلا۔

کچھ اندو سنبھلی!

اگلے چند ساعتوں کے لئے دونوں کے جسم ایکدوسرے میں گڑے رہے۔ پھر دونوں نے اپنے آپ کو الگ کرنے کی کوشش کی تو اسے محسوس ہوا کہ نہ صرف کہنیوں کے مقام پر درد ہو رہا ہے بلکہ پاؤں میں ایسی شدت کا درد آ چکا ہے کہ اب وہ خود سے چل بھی نہیں سکتی۔

ایک قدم لے کر کراہ کر بیٹھ گئی۔

اس دودھیا رنگت والے نوجوان نے اسے اٹھا کر کہا۔ "آپ کو اکیلا نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"وہ لوگ نیچے کھلی مرگ میں رہ گئے!"

اندو کراہ کر بولی۔

مگر اب کہ جب اس نوجوان اسے اپنی باہوں میں اٹھا لیا تھا۔ اسے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"کیا میں آپ کو نیچے لے چلوں کہ آپ الپّھر کی جھیل دیکھ کر ہی جائیں گی" اس نے سوال کیا۔

"بھاڑ میں جائے جھیل ویل! مجھے فوراً نیچے لے چلو!"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اتنی دور آ چکا ہوں۔ اب جھیل دیکھے بغیر نیچے نہیں جاؤں گا۔"

"اگر تمہیں ایسا ہی کرنا تھا، تو مجھ سے پوچھا ہی کیوں تھا؟... مسٹر؟"

"مجھے کمل مصرانی کہتے ہیں۔ اور تمہارا نام نیلوفر ہے شائد؟"

"نہیں! میں نیلوفر نہیں ہوں۔ مجھے اندو کہتے ہیں!" وہ آہستہ سے مسکرائی "تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میرا نام نیلوفر ہوگا؟"

"پتہ نہیں کیوں؟ یونہی خیال آیا کہ اس طرح کی لڑکی کا ایسا ہی نام ہونا... چاہیئے!"

"کس طرح کی لڑکی؟"

اندو نے پوچھا۔

کمل اسے اٹھائے چلتا رہا۔

بولا۔

"میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ تم پھسل جاؤ۔ برف پر پھسل کر گر پڑو۔

بار بار پیچھے سے چلتے ہوئے تمہاری طرف دیکھتے ہی تمہیں گرانے کے لئے اپنی قوت ارادی صرف کرتا رہا۔" وہ خوش ہو کر بولا "اور تم گر پڑیں۔

اور میری باہوں میں آ گئیں۔

اور اب!

میں تمہیں چوم سکتا ہوں!"

"مجھے نیچے برف پر رکھ دو..... ابھی..... اسی لمحے!"

اندو نے حکم دیا۔

"پہلے چوم تو لوں!"

کل نے بے حد دن جوئی سے اندو کو اچھی طرح سے اپنی باہنوں میں اکٹھا کیا۔ پھر اچھی طرح سے اُسے پیار کیا۔

اس دوران وہ چلتا بھی رہا۔

اندو نے مزاحمت کی کوشش شروع ہی کی تھی کہ اس نے چلتے چلتے کہا: "اگر میری باہنوں سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم دونوں گر سکتے ہیں۔ نیچے برف پر پھسل سکتے ہیں۔

لہذا مجھے اپنا وعدہ پورا کر لینے دو۔"

"کیسا وعدہ؟"

"ابھی آدھ گھنٹہ پیشتر میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس لڑکی کا مُنہ ضرور چوم لوں گا۔ اور تم نہیں جانتیں شائد کہ کل معرانی ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے اندو کو پھر چوما۔

اندو نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بے حد شفید، نفرت انگیز حد تک سفید تھا۔ لگتا تھا بالکل مکھن کا بنا ہوا ہے۔ ایسا ہی اس کا بوسہ تھا۔

اخ.....

بس اس کے بعد کچھ نہیں! ——— اب وہ بے حد مودب ہو گیا۔ جیسے کچھ نہ ہوا تھا۔

اب!

وہ بڑے قاعدے اور قرینے سے اُسے ایسے اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ جیسے قلی بوجھ اٹھا کر چلتے ہیں۔

الپتھر جھیل کے کنارے پہنچ کر اُس نے اندو کو نیچے ایک پتھر پہ بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنے کیمرے سے جھیل کی اور اندو کی تین تصویریں لیں۔ پھر اس نے کیمرہ اندو کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"اب تم میری تصویر لے لو!"

اندو نے دو تصویریں لیں۔

اس کے بعد اس نے اندو سے کہا۔

"اب واپس چلیں!؟"

"فوراً ــــ!"

"کیا تم چل سکتی ہو؟"

اندو نے چٹان سے اٹھنے کی کوشش کی

ناکام ہو کر روانسی ہو کر بولی۔

"نہیں!"

"تمہیں اکیلا نہیں آنا چاہئے تھا؟"

اندو غصے سے بھڑک کر بولی۔

"تم نے دوسری بار یہ بات کہی ہے۔ حالانکہ میں بتا چکی ہوں کہ میرے آدمی نیچے کھلی سڑک میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ آتے۔ مگر انہیں وقت ہو گیا۔ اور دوسری لڑکی بھی کمزور اور خائف معلوم ہوتی تھی۔

اور وہ احمق کرسٹ جی!؟

میں نے اُس سے کہا تھا کہ گائیڈ ساتھ لے لو۔ مگر وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ اتنی بلند میں یہاں آ چکا ہوں۔

کہ میں اکیلا ہی کافی ہوں! کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں۔ کھلن مرگ تک آتے آتے وہ شدید دمے میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے سوسن سے کہا، وہ اسے نیچے لے جائے۔"

"ہاں! یہ تو اچھا کیا۔ اتنی بلندی پر آکسیجن کی بے حد کمی ہو جاتی ہے۔"

کمل نے کہا۔ پھر مسکرا کر اور ہاتھ ہلا کر بولا۔

"بائی، بائی.... میں چلتا ہوں!"

اس نے اتنا کہہ کر نیچے کی طرف قدم بڑھایا۔

"یہ بھی کوئی شرافت ہے۔" اندو نے غصے سے بولی۔ "مجھے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟"

"میں کوئی قلی نہیں ہوں!" کمل نے جھنجھلا کر کہا۔ "اتنے بوجھ کو لے کر برف پر چلنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مگر ایسے سے نکمّا قلی بھی دس دفعہ سوچے گا۔"

"میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گی؟"

"میں پانچ بار راستے میں تمہیں چومو ں گا۔"

"ہشت!"

"گڈ بائی!"

کہہ کر کمل نیچے کو چلا۔

دو تین قدم لینے کے بعد، اندو نے اُسے گھبرا کر آواز دی۔

"اے کمل!"

"کیا ہے؟" وہ رک کر بولا۔ "میری شرط منظور ہے؟"

اندو نے روہانسی ہو کر کہا۔

"نہیں ـــــ ہرگز نہیں!"

کمل بولا۔

"تو آرام سے اس چٹان پر آرام کرو۔ رات کو کوئی کہستانی ریچھ تمہیں ریپ کر کے اپنے غار میں لے جائے گا۔

بڑی دل چسپ بات ہوگی۔

اخباروں کے پہلے صفحے کی سرخی..... بائی۔ بائی!"

"وہ اوپر والا تمہیں غارت کرے!" اندو غصے سے چلائی "مجھے یہاں سے اٹھا لو۔ اٹھا لو نا...."

وہ رو کر بولی۔

کمل نے اسے اٹھا لیا۔

غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

"ایک!"

اندو چپ چاپ اس کی باہنوں میں سمٹ گئی۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا تھا۔

'وہ الو۔ گدھا۔ شیخی خور کرسٹ جی اگر اس پر اپنا رعب جمانے پر نہ تل جاتا اور کسی مقامی گائیڈ کو اپنے ساتھ لے آتا تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ مگر اب وہ بالکل بے بس تھی نیچے جانے کے لئے!

نیچے گلمرگ تک پہنچنے کے لئے!!

اس نوجوان کی باہنوں کا سہارا لینے کے لئے مجبور تھی۔ راستے میں دوسرے سیاحوں کی ٹکڑی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنہیں روک کر وہ مدد کے لئے طالب ہوتی ان سے!

اور اس کمبخت کمل کے چہرے پر کیسی تضحیک آمیز مسکراہٹ ہے۔ جی چاہتا

ہے۔ منہ نوچ لوں، اس کمبخت کا!

"دو"

"ــــ"

"ــــ"

"پانچ!"

نیچے گلمرگ کی پیالہ نما وادی میں پہلی کاٹیج کے قریب آ کر کمل نے کہا۔ اور اندو تڑپ کر اس کی باہوں سے اچھلی اور تڑاتڑ اس نے چار پانچ طمانچے کمل کے رخسار پر جڑ دیئے۔

پر اب وہ کیا کر سکتا تھا؟

اب یہ سامنے ایک کاٹیج تھی۔ وہ یہاں سے کسی کو مدد کے لئے پکار سکتی ہے۔ اور یہاں سے اپنے کاٹیج مدد کے لئے پیغام بھیج سکتی ہے۔

کمل نے انتہائی سنجیدگی سے اور بغیر کسی خفگی کے کہا۔

"مجھے تم سے اسی سلوک کی امید تھی۔ تم سر بومن کی بیٹی ہو۔ میں سیٹھ جاسن عمرانی کا بیٹا ہوں۔

تمہارے باپ کی جائیداد کی کل مالیت بھی دو ڈھائی کروڑ ہوگی۔ میں اپنے باپ کی چار کروڑ کی جائیداد کا وارث ہوں۔

ہم دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف ہو کر ایک دوسرے کو پسند کرنا چاہیئے!"

کمل عمرانی نے اتنا کہہ کر اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اندو کو دیا۔ "یہ میرا مکمل ایڈریس ہے۔

پرسوں میں نیلنڈوز میں سپرنگ بال ہے۔ میں تمہیں لینے کے لئے آؤں گا..... گڈ بائی..... وہ سامنے کاٹیج میں ایک نائی بابا نیچے میں کام کر رہا ہے۔ میں اسے تمہارے

پاس بھیجے دیتا ہوں۔ گڈ بائی!"

وہ ہاتھ ہلا کر چلا گیا۔

جس دن وہ سپرنگ بال کے لئے اسے لینے آیا۔ اس وقت تک اندو کا ارادہ نہ صرف اسے انکار کر دینے کا تھا بلکہ اس کی اچھی طرح سے بے عزتی کر دینے کا تھا۔ کتنے ہی دن تو وہ اندر ہی اندر کھولتی رہی۔

منصوبے بناتی رہی۔

سر لومن سے شکایت کے لئے سوچتی رہی۔

مگر ــــ

جس دن کمل مضرانی اسے لینے کے لئے آیا۔ وہ بالکل تیار بیٹھی تھی۔ بال میں جانے کے لئے!

اس نے کوئی چوں چپڑ نہیں کی۔

کمل کی باہنہ میں باہنہ ڈال کر سپرنگ بال میں رقص کرنے کے لئے چلی گئی۔

بال کے دوران میں وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔

دو دو مارٹینی اندر اور جسم گرم۔

اور وہ کمبخت بیحد اچھا ناچتا ہے۔ اور اب کس قدر سیدھا ہے۔ بالکل قاعدے میں سلیقے سے گفتگو کرتا ہوا،

مہذب طور طریقوں والا ایک معقول نوجوان!

اُن کے بالکل اوپر چاند سفید سمور کی ٹوپی کی طرح چمک رہا ہے۔ کمل نے اس سے پوچھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

"اتنی جلدی؟ ــــ کیوں؟ ــــ ابھی تو ہم ایکدوسرے کو جانتے تک نہیں!"

"جانتے نہیں، یہی اچھا ہے۔ جس لمحے ہم ایکدوسرے کو جان گئے۔ اسی لمحے ہم ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔

محبت کے لئے اجنبیت بے حد ضروری ہے۔

اسی لئے شروع کے چند ماہ میاں بیوی کے بہت اچھے گذرتے ہیں۔ پھر جب وہ سہانے اجنبی دن، روزمرہ کی یگانگت میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو نفرت شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ گھری واقفیت میں خوبیاں ہی نہیں جانی جاتیں، خامیاں بھی پہچانی جاتی ہیں جن کی تعداد انسانی فطرت میں خوبیوں کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہے۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسی اجنبیت کے موسم میں جب ہم ایکدوسرے کو جانتے نہیں ہیں، شادی کر لیں!"

"میں تمہارے ایسے پگلے سے کبھی شادی نہیں کروں گی!"

"اچھی طرح سے سوچ لو۔ مجھ سے بہتر دولہا تمہیں ہندوستان بھر میں نہیں ملے گا۔ فلمی ہیرو کی طرح خوبرو!

امریکی لکھ پتی کی طرح امیر و کبیر!!

اور شاعروں کی طرح بے وقوف!!!

تمہارے ایسی عقلمند لڑکی کو اس سے بہتر بر نہیں مل سکتا۔ اگر کسی طرح کا شبہہ ہو تو اپنے باپ سے پوچھ سکتی ہو۔"

اندو کے دل میں ایک شبہہ آیا۔

اس نے چونک کر کمل کی طرف دیکھا جو اپنے ہاتھ کے ناخون غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم نے پپا سے بات کی ہے؟"

اندو نے گھبرا کر پوچھا۔

کمل نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"پھر ـــــ ؟ انہوں نے کیا کہا ؟"

"بولے۔

"میری ایک ہی شرط ہے۔ لڑکا لکھ پتی ہونا چاہیئے۔ باقی ہر بات کا فیصلہ اندو کرے گی۔ باقی ہر پسند ناپسند اس کی ہو گی!" ـــــ"

اندو کو اطمینان ہو گیا۔

مسکرا کر بولی۔

"تو میرا فیصلہ ہے ـــــ نہیں، نہیں! میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گی!!"

"اچھی طرح سوچ لو۔ میری زندگی میں تم پہلی لڑکی نہیں ہو، مگر پہلا چانس تمہیں دے رہا ہوں۔

ورنہ ہر روز ایک درجن پرپوزل آتے ہیں۔ ایک سے ایک بہتر!"

"تم اپنی توجہ کا مرکز دوسری لکھ پتی لڑکی کو بنا لو۔ تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔ اور میری بھی!"

کمل اس کے قریب آنے لگا۔

اندو آہستہ سے کہنے لگی۔

"یہ کھیل مرگ کی مٹھائی نہیں ہے۔ اس وقت میں بے بس تھی۔ اب میں سب کے سامنے تمہاری بے عزتی کر ڈالونگی!"

"چند بوسوں کو تم اس قدر اہمیت دیتی ہو۔ آخر اس میں ہے کیا؟

دو ہونٹ دو ہونٹوں سے چند لمحوں کے لئے ملتے ہیں۔ پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ وقت اچھی طرح سے گزر جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی اہمیت بھی نہیں ہے!" کمل نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ پھر رک کر کہا "مگر تم سوچنے کے لئے وقت لے سکتی ہو۔ اس میں جلدی کیا ہے۔

میں انتظار کر سکتا ہوں۔

جلدی تو ان لوگوں کو ہو سکتی ہے جنہیں جوان ہو جانے پر لڑکی نہیں ملتی۔ یا لڑکا نہیں ملتا۔ لیکن ہم لوگوں کو ایسی کونسی مشکل درپیش ہے۔"

نگار مرگ میں کل ملا تھا۔

مسوری میں درپن۔

نینی تال میں روشن جو بمبئی کے سیٹھ عالم بھائی کا بڑا لڑکا تھا۔ جو ہر دوسرے تیسرے مہینے امریکہ جاتا تھا۔ اور وہاں سے نت نئے گیجٹ لے کر آتا تھا۔ پولورائیڈ کیمرہ، اور منی ٹیلی ویژن اور عینک میں دوربین، اور ایک چھوٹے سے کلوب میں ٹرانسسٹر اور ریکارڈر اور ایک چھوٹا سا کمپیوٹر جو شاعری کرتا تھا۔

روشن بھائی عالم بھائی مشینوں کا مجنوں تھا۔

جبکہ اندو کو مشینوں سے نہ نفرت تھی، نہ محبت!

ایک طرح کا ڈر سا تھا کیوں کہ ماڈرن مشینوں سے اس کی واقفیت چند ماہ کی تھی۔ اس لئے کیوں دبلے پتلے، لمبے چھریرے، سانولے، سبزی مائل رنگت والے سنجیدہ روشن عالم بھائی نے اندو کو پسند کر لیا؟

یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

شملہ میں سردار اوتار سنگھ ملا تھا۔

جس کی بنگلور میں الیکٹرانکس کی بہت بڑی فیکٹری تھی۔ اوتار ہاکی کا مشہور کھلاڑی تھا۔

دو دفعہ اولمپک کھیل آیا تھا۔

اور آج کل ستار بجانا سیکھ رہا تھا۔
یہ سب لوگ مختلف مذہبوں، نسلوں، رنگوں، تہذیبوں اور کلچروں کے نوجوان افراد تھے۔
لیکن نہ جانے کیوں اندو کو ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب ایک ہی بیج سے پھوٹے ہیں۔
ان سب کی عادتیں ایک سی تھیں۔
خصائل ایک سے۔
پسند ناپسند ایک سی۔
اور زاویہ نگاہ ایک سا۔
لگتا تھا کسی ایک ہی مشین میں ڈھالے گئے ہیں۔
گو سربومن نے کبھی کچھ کہا نہیں اس سے۔ لیکن اندو کو معلوم ہو گیا تھا کہ ایک ایک کر کے مختلف چہرے اس کے راستے میں پھینکے جا رہے ہیں۔
وہ انتخاب کر سکتی ہے۔
لیکن وہ انتخاب کیسے کرے۔ صرف چہرے مختلف ہیں۔ باقی ٹھپہ، سانچہ، رنگ و روغن ایک سا ہے۔
اس لئے اندو ایک کے بعد دوسرے کو انکار کرتی چلی گئی۔ اور اب وہ اس معاملہ میں خاصی ماہر ہو چلی تھی۔
پھر ان میں وہ پگلا درپن کھتری بھائی تھا۔
جو ہولناک حد تک امیر تھا۔ جس کی احمد آباد میں دس بارہ ملیں تھیں۔ اور کئی صوبوں میں جس کا صنعتی جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ بڑے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔ ان موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے کیسی عجیب نگاہوں سے اُسے گھورتا تھا۔ معلوم نہیں اسے احمقوں کے پاس اتنی دولت کیسے آ جاتی ہے؟

اور پھر پشت دا پشت کیسے رہتی ہے؟

درپن کھنیو بھائی نے مسوری سے شملے اور شملے سے نینی تال تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ نینی تال میں آخری ملاقات اندو کو کبھی نہیں بھول سکتی۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ درپن کھنیو بھائی کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی لڑکی اُسے انکار بھی کر سکتی ہے۔ اندو کے دبے دبے مہذب شرمیلے انکار کو اس نے توجہ کے لائق ہی نہیں سمجھا تھا۔

پھر اس کے پاس سوالوں کی ایک فہرست تھی جس کے جواب آج ہی اندو سے مانگ رہا تھا۔

کہاں سے یہ پگلا پیچھے پڑ گیا اس کے؟

وہ دونوں درپن کے کہنے پر پاٹ کلب کے چھتے ہوئے برآمدے میں چھلی کی طرح والے لکڑی کے جنگلے کے قریب بیٹھ گئے تھے۔

اور درپن کھنیو بھائی نے اپنے سوالوں کی فہرست نکال لی تھی۔ اور اپنی عینک کو اپنی ناک کے چوڑے بانسے پر ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

"یہ چند سوال ہیں!"

"کاہے کے لئے؟"

اندو نے پوچھا۔

"تم سے پوچھنے کے لئے؟"

"کاہے کے لئے؟"

"تمہارا IQ معلوم کرنے کے لئے..... مجھے بابو نے کہا ہے کہ جس لڑکی سے تم شادی کرنے کا بچار کر رہے ہو، وہ ذہین ہونی چاہیئے! اس لئے میں نے یہ سوال تیار کئے ہیں۔"

"اگر میں ان سوالوں کے ٹھیک جواب نہ دے سکی!"

"تو ـــــ مجبوری ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گا!" درپن نے اسی سنجیدگی سے کہا کہ اندو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

درپن نے حیرت زدہ ہو کر اندو کی طرف دیکھا۔

کہنے لگا۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟"

"یوں ہی، تم سوال پوچھو۔"

"تم کو کس طرح کا مرد پسند ہے؟"

درپن نے پہلا سوال کیا۔

"اصلی!"

اندو نے جواب دیا۔

"اور عورتوں میں کونسی عورت پسند ہے؟"

"چنگی!"

"اور بچوں میں کونسا بچہ پسند ہے؟"

"نقلی!"

"نقلی؟ کیا نقلی بچے بھی ہوتے ہیں؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں ہوتے۔ یہ پلاسٹک کے بڑے بڑے ہوئے نقلی نہیں تو کیا ہیں؟!"

"تو تم کو نقلی بچے پسند ہیں؟"

"ہاں ـــــ!"

اندو کو معلوم ہو گیا کہ ابھی تک اسے ہر سوال کا صفر نمبر مل رہا ہے۔

فہرست دیکھ کر درپن کھلتو بھائی نے اگلا سوال کیا۔

"تمہیں مشینوں میں سے کون سی مشین پسند ہے؟"

"ہکلی!"

"اور گیت گانے والیوں میں سے کون سی پسند ہے؟"

"ہکلی!"

"ہکلی؟"

درپن نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہکلی!!"

اندو نے قطعیت سے جواب دیا۔

"اور بجانوروں میں کون سا جانور پسند ہے؟"

"چھپکلی!"

درپن کھلتو بھائی نے لمبی فہرست کے بہت سے سوالوں کو نظر انداز کر کے آخری سوال پوچھا۔ بیحد سنجیدگی سے میز پر کہنیاں ٹکائے اپنا لمبوترا چہرہ آگے لے جا کے بولے۔

"آخری سوال پوچھتا ہوں۔ بس اسی پر دارو مدار ہے کہ تم سے شادی کروں گا یا نہیں!"

"پوچھو۔ پوچھو۔"

"سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

اندو نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر کے کہا۔

"پوچھو۔ پوچھو۔"

"شادی شدہ زندگی میں تم سوچ بچار کر کے کون سی ڈگر پر چلو گی؟"

"بے عقلی!"

اندو نے چہک کر کہا۔

درپن کھلتو بھائی اندو پر افسوس اور کسی قدر حقارت کی نگاہ ڈال کر فہرست کو جیب میں ڈال کر میز سے رخصت ہو گیا تھا۔

اور اندو ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی تھی۔ ایسا پگلا اس نے اپنی عمر میں نہیں دیکھا تھا۔

اور اب اس وقت!

اپنے محل نما گھر میں ماٹینی کا جام اپنے سامنے رکھے اندو کو درپن کے علاوہ دوسرے درجنوں چہرے یاد آ رہے تھے۔ اور وہ ان کی بیچینی، بیتابی، غرور، حمق کو شائد چاپلوسی، مرعوب ـــــ کرنے کے انداز یاد کر کے مسکرا رہی تھی۔ کچھ لوگ ان میں ایسے برے بھی نہیں تھے۔

کچھ لوگ خاصے اچھے تھے۔ جیسے کل مہرانی! جواب تک اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

اور آج شام کی مجلس میں بھی آ رہا تھا۔

مگر اندو اپنے دل کو ٹٹولنے لگی۔

آخر وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے؟

ان سب مردوں کو وہ کب تک انکار کرتی رہے گی؟

سر لومن کچھ کہتا نہیں تھا۔ مگر اس کی خاموش نگاہیں بے حد متکلم تھیں۔

اتنے میں سوسن ڈاک لے آئی۔ ڈاک میں شادی کا ایک خوبصورت سا کارڈ تھا۔ جلدی جلدی اس نے لفافہ کھولا۔ ایک ہاتھ میں لفافہ کھول کر دیکھتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ماٹینی کا جام اٹھا کر گھونٹ پیتے ہوئے، وہ اُسے اوپری نظروں

سے دیکھ رہی تھی کہ یکایک جام اس کے ہاتھ سے نیچے گر کر چٹاک سے ٹوٹ گیا۔

رنجیت کی شادی رانی بالا سے ہو رہی تھی۔

رنجیت ؟

رانی بالا ؟؟

دس اکتوبر ـــــ یعنی صرف دو دن بعد ؟!

اندو کٹی پتنگ کی طرح صوفے پر گر پڑی۔

غصے میں اندھی ہو کر اندو بومن لاج کی ساری سیڑھیاں نیچے اتر گئی۔ اس نے باہر جانے کے لئے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ سیدھے گیراج میں جا کر اس نے رئیس سے کہہ کے اپنی ڈی سوٹو نکلوائی اور چلدی۔

"کہاں چلو ؟"

رئیس ڈرائیور نے پوچھا۔

"تم یہاں سے باہر نکلو!" اندو نے اپنی مٹھیاں تنتے ہوئے کہا "پھر بتاتی ہوں!"

ڈی سوٹو کف پریڈ کے ساحل سے ہوتی ہوئی میرین ڈرائیو پر آنکلی، اندو بار بار غصے سے دانت پیستی تھی۔ اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھولتی اور بند کرتی تھی۔

رئیس نے پوچھا۔

"اب کہاں چلوں ؟"

"مہالکشمی ریس کورس!"

اندو نے گرج کر کہا۔

"میم صاحب بہت غصے میں ہیں!" رئیس نے کار گھماتے ہوئے سوچا "مگر جانے غصہ کس پر ہے ؟ جو مجھ پر اتر رہا ہے۔ میں نے آج تک میم صاحب کو

اس قدر خفا نہیں دیکھا۔

مگر خفا ہو کر کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے!

سالی! اگر بومن کی لڑکی نہیں ہوتی تو ابھی جو ہو لیجا کر اسے سمندر کے کنارے پٹ کر دیتا۔ پر چار سو روپیہ لگا دیتی ہے۔ اور بخشش انعام اوپر سے اور دس برس کی نوکری ہے۔

ورنہ بتاتا میم صاحب کو ابھی کہ ہم پر غصہ کرنے سے کیا مطلب ہے تمہارا!؟

اس لئے رمیس احمد آرام سے سٹرنگ وہیل تھامے۔ جو دن بھر ٹھنڈے ٹھنڈے ڈیوٹی کیا تا۔

رات کو بیوی کو دو چانٹے مار کر اس کا بدلہ نکال لیتا۔

"سالی ہلکٹ، یہ بیس برس کی چھوکری ہم پر بھڑکتی ہے، کاہے کو؟"

مگر ——

اندو اپنے غصے میں اس قدر جل بھن رہی تھی کہ اس نے رمیس کا ردِ عمل نہیں دیکھا۔ جب گاڑی رنجیت کے باپ کے گیراج کے قریب پہنچ گئی تو اس نے رمیس سے کہا۔

"رنجیت کو بلا لاؤ؟"

"تو یہ بات ہے۔ سالی رنجیت کو ابھی تک نہیں بھولی۔"

رمیس نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ اتنے جھیلنے سے اندو نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

وہ تو دن رات اس کی ڈیوٹی میں رہتا تھا۔ اس لئے اسے معلوم تھا۔ پر اب اچانک اسے رنجیت کی یاد کیسے آ گئی؟ رمیس کا خیال تھا کہ وہ اب رنجیت کو بالکل بھول چکی ہے۔

وہ انجن بند کر کے گیراج کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کو ساتھ لے کر آیا۔

رنجیت کو دُور سے آتے دیکھ کر اندو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ رنگ فق ہو گیا۔

ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

وہ اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

رنجیت رئیس کے ساتھ ساتھ آہستہ پُر وقار انداز میں چلتے ہوئے آ رہا تھا۔ جیسے اسے مطلق کسی طرح کی عجلت نہ ہو۔

جب وہ بالکل قریب آ گیا۔ تو اندو نے گاڑی کا پٹ رنجیت کے لئے کھول دیا۔ مگر رنجیت گاڑی کے اندر نہیں آیا۔

کھلا پٹ ہاتھ میں پکڑے وہیں کھڑا رہا۔

اندو نے رئیس سے کہا۔

"تم کہیں سے چائے پی کے آؤ!"

رئیس گھوم کر مہالکشمی اسٹیشن کی طرف مُڑ گیا۔ جب وہ کافی دور نکل گیا۔ تو اندو نے رنجیت سے پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے؟"

"کیا سچ ہے؟"

"تمہاری شادی رانی بالا سے ....."

"ہاں!"

"کارڈ تم نے بھیجا تھا؟"

"میں نے نہیں ـــــ رانی بالا نے بھیجا تھا۔"

"حرام زادی!"

"اُسے گالی مت دو۔ میری ہونے والی بیوی ہے وہ!"

جواب میں اندو نے رانی بالا کو دو چار صلواتیں اور سنائیں۔ رنجیت خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر جب اندو خاموش ہو گئی۔ تو آہستہ سے کہنے لگا۔

"بس! اب میں جاؤں؟"

"نہیں ٹھہرو!"

اندو کڑک کر بولی۔

"کس رشتے سے مجھ پر یہ حکم چلا رہی ہیں؟"

اندو نے اس سوال کا جواب نہ دے کر اس سے کہا۔

"تم رانی بالا سے شادی نہیں کرو گے!"

"کروں گا!"

رنجیت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"نہیں کرو گے!"

"ضرور کروں گا!"

اندو ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی۔

"میں کہتی ہوں یہ شادی نہیں ہو گی!"

"میں کہتا ہوں یہ شادی ضرور ہو گی!!"

اب رنجیت کو غصہ آنے لگا تھا۔

رنجیت کا فیصلہ کن لہجہ اور پُر اعتماد چہرہ دیکھ کر اندو یکایک چپ ہو گئی۔ اپنے آپ کو بے بس پا کر خاموش ہو گئی۔

مڑ مڑ کر رنجیت کا مُنہ دیکھنے لگی۔ جو اس کی طرف نہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپنے آپ کو بے بس پا کر اندو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔ اس نے مُنہ پھیر کر رنجیت سے سوال کیا۔

"کیوں؟"

اس کی آواز آنسوؤں کی لڑی سے لرزاں تھی۔

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" رنجیت نے آہستہ سے کہا اور آہستہ آہستہ اس کا لہجہ درد کی مدھم آنچ میں تپنے لگا۔

"اس شام تم وعدہ کر کے مجھ سے میرین ڈرائیو ملنے نہیں آئیں!"

"مگر تم کبھی تو مجھ سے ملنے نہیں آئے!!"

اندو کی آواز کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

"میں کیوں آتا؟ اور کیسے آتا؟ جب تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ جب تم واپس اس محل میں جا کر ایک کروڑ کی بوتل میں بند ہو گئیں۔ تو میری قسمت کی آواز تم تک کیسے پہنچتی۔

ابھی محبت بوتلوں میں بند ہو کے نہیں بکتی ہے۔ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا ہے۔"

"اسی لئے تم رانی بالا سے شادی کر رہے ہو؟"

"ہاں!" رنجیت کے نرم لہجے میں یکایک فولاد کی سی سختی آ گئی "جب تم میری محبت کی وفادار نہ رہ سکیں، تو میں تمہاری محبت کا وفادار کیوں رہوں؟"

"مگر میں نے تو اب تک کسی سے شادی نہیں کی!" اندو رو کر بولی "اتنے اتنے رشتے آئے میرے لئے مگر میں نے سب کو ٹال دیا!"

"مجھے معلوم ہے۔ تمہاری ایک ایک خبر مجھے رہتی ہے۔ میں وہاں نہیں ہوں تو

کیا ہوا؟" رجنیت بولا "میرے ہمدرد تو وہاں ہیں، میرے دوست، میرے آدمی جو ہر جگہ گزشتہ دنوں میں تمہارے ساتھ تھے۔

جہاں جہاں تم گئیں،

جو جو تم سے ملا،

تمہاری ہر بات، ہر حرکت کا مجھے علم ہے۔ غریب لوگوں کی بھی ایک سی آئی ڈی ہوتی ہے۔ جو نوکر خانے سے چلتی ہے۔"

"میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔"

"سب سے بڑا پاپ تو تم کر چکی ہو۔ جب تم نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔"

یکایک اندو نے رجنیت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور گہرے تعلق کے ساتھ بولی۔

"رجنیت! میں اب اس گندی موری میں نہیں رہ سکتی تھی۔ کوئی بھی جب کھلے آسمان میں تیرنے کے لئے پنکھ مل جائیں گے۔ گندی موری میں رہنا پسند نہیں کریگا۔"

"پھر کس بات کی شکایت ہے؟" رجنیت اپنا ہاتھ چھڑا کر بولا "جو تم نے چاہا وہ تمہیں مل گیا۔ اب مجھے اپنی زندگی کے راستے پر جانے دو۔ جب تمہاری میری زندگی الگ الگ ہے تو کسی کو کسی سے کیا شکوہ؟"

اتنا کہہ کر رجنیت نے گاڑی کا پٹ زور سے بند کیا اور مزید کچھ کہنے سنے بغیر پٹھہ موڑ کر گیراج میں چلا گیا۔

رات بھر اندو کو نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے سحر ہو گئی۔ ریشمی چادر نرم ابرو کے تکیے۔ سپرنگ والا پلنگ، مدھم روشنیاں، ایر کنڈیشنڈ فضا، موسیقی، خادماؤں کے نرم نرم ہاتھ پاؤں دبانے کے لئے، نیند کی گولیاں ——— سب بیکار ثابت ہوئیں۔ روتے روتے صبح ہو گئی۔ صبح آئینے میں جب اس نے منہ دیکھا تو آنکھیں سوجی سوجی معلوم ہوتی تھیں۔ بہت دیر تک وہ بورومنی لوشن سے اپنی آنکھیں

دھوتی رہی۔ جب آنکھوں کی سُرخی کچھ کم ہوئی تو اس نے چائے منگائی۔ چائے منگا کر کرٹ جی کو ٹیلیفون کیا۔

"فوراً چلے آئیے۔ ناشتہ یہیں کیجیے!"

کہہ کر اندو نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ رات بھر وہ سوچتی رہی تھی۔ ایک طرح سے رنجیت سچ کہتا ہے۔ جب اس نے خود ہی رنجیت کو چھوڑ دیا تو اب وہ رنجیت کی زندگی میں دخل دینے والی کون ہوتی ہے؟ مگر کیا سچ مچ اس نے رنجیت کو چھوڑ دیا تھا؟ اوپر سے تو اس نے واقعی اُسے بھلا دینے کی کوشش کی تھی۔ ٹھیک ہے وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ تو وہ کب اس سے ملنے گئی تھی؟ اب وہ کیا مُنہ لے کر اس سے ملنے جاتی؟ شاید اس لئے وہ اس سے ملنے نہیں گئی تھی۔ اس نے نئی زندگی کی خوشیوں میں رنجیت کو بھلا دینا چاہا تھا۔ اور شاید رنجیت اس کے دل کی گہرائیوں میں یوں دب کے رہ گیا تھا۔ جیسے زمستان کی گہری برف میں پتھر کی چٹان دب کے رہ جاتی ہے۔ خود اسے برف کی اس اوپری سفید سطح کو دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس کے اندر گہرائیوں میں رنجیت دبا پڑا ہے۔ مگر اس شادی والے کارڈ نے ایک ہی ہلّے میں برف کے تودوں کو ہٹا کر اندر کی چٹان کو ننگا کر دیا تھا۔ جسے اندو اپنے آپ سے بھی چھپاتی آئی تھی۔ وہ اس سچائی کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے اسے اس قدر غصہ آ رہا تھا۔ کیا حق ہے رنجیت کو شادی کرنے کا؟

عورت کا دل منطق نہیں سمجھتا یا عورت کے دل کی منطق ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی لئے تو اندو کا دل رنجیت کے شادی کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ میں جو کچھ کروں!

تم یہ کیوں کرو؟

تم تو رانی بالا سے پیار نہیں کرتے ہو؟

پھر تم اس سے شادی کیوں کرو؟

میں چاہے دس بار شادی کر لوں پر تم میرے جیتے جی کیسے شادی کر سکتے ہو۔ تم تو میرے ہو۔

اور میں تمہیں جس حال میں رکھوں گی۔ اسی میں تمہیں ساری عمر رہنا ہوگا۔ مگر رنجیت تو بدلہ لینے پر تل گیا تھا۔

تو ٹھیک ہے!

اب وہ بھی بدلہ لے گی!

اندو نے غصہ سے گھنٹی بجائی۔ ایک خادمہ نمودار ہوئی۔ اندو بولی "جونہی کرسٹ جی آجائیں، انہیں لاؤنج میں بٹھا کے مجھے خبر کر دو!"

"جی بہت اچھا"

کہہ کر نوکرانی چلی گئی تو اندو کو چائے ٹھنڈی معلوم ہونے لگی۔ اس نے غصہ سے پھر گھنٹی بجا کے اچھی بھلی چائے کو ٹھنڈا کہہ کر دوسری نوکرانی کو کوسا اور اسے دوسری چائے لانے کو کہا۔

پھر!

ٹیلیفون کے نمبر ملائے اور تیز لہجے میں بولی۔

"کرسٹ جی آپ آتے کیوں نہیں ہیں؟ ——— ابھی تک گھر میں کیا کر رہے ہیں؟!"

"ذرا دانتوں میں منجن تو کر لوں!؟"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس حالت میں بھی ہیں۔ فوراً آجائیں آپ!"

"جس حالت میں ہوں۔ اس حالت میں تو کسی طرح نہیں آسکتا!؟ صرف چڈی پہنے ہوں۔"

بے اختیار اندو کو ہنسی آ گئی۔

اس نے جلدی سے ٹیلیفون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے میں کرسٹ جی اس کے پاس تھا۔ اندو نے شادی کا دعوتی کارڈ خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دیا۔

کرسٹ جی نے چشمہ ٹھیک سے کر کے کارڈ کو غور سے پڑھا۔ پھر خاموشی سے اندو کی طرف دیکھنے لگا۔

بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

"میں چاہتی ہوں یہ شادی نہ ہو!"

کرسٹ جی نے چونک کر اندو کی طرف دیکھا۔ اب بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

"مگر...."

کرسٹ جی نے بولنا شروع کیا۔

"اگر مگر کچھ نہیں!"

اندو نے پیر ٹپک کر کہا۔

"کچھ بھی ہو جائے۔ یہ شادی نہیں ہو گی۔ ہر قیمت پر اُسے روک دینا ہو گا!"

"کیا اس چھوکرے کے لئے تم ابھی تک اس قدر پاگل ہو؟"

"میں رنجیت سے شادی نہیں کر رہی ہوں۔ کبھی کسی حالت میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر تمہارا اس طرح کا کوئی خیال ہے تو اس کے لئے میں ہر وقت گارنٹی دینے کے لئے تیار ہوں۔ مگر یہ شادی رک جانا چاہیئے!"

عورت انتقام میں کس قدر خطرناک ہو جاتی ہے!

آج!

کرسٹ جی کو ذاتی طور پر اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر اس جذبۂ انتقام کو وہ کس طرح اپنے لئے جذبۂ راحت بنا سکتا ہے؟ ـــــ اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا۔

"زیادہ سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے۔"

اندو نے بے صبری سے کہا۔

"اگر یہ شادی نہیں رُکی تو اپنی جان دے دوں گی۔ زہر کھا لوں گی۔ سمندر میں کود جاؤں گی۔"

"اچھی طرح سے سوچ لیجئے!" کرسٹ جی نے رک رک کر کہا۔ "بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔"

"میں نے خوب سوچ لیا ہے!"

اور آپ اس کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں!" کرسٹ جی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"یعنی اگر میں اس شادی کو روک لوں۔ تو آپ مجھے منہ مانگا انعام دینگی۔"

"ہاں!"

اندو نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہاں بھری۔

کیونکہ وہ بھی سمجھتی تھی۔ کہ اس سے کیا مانگا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی سمجھتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

کرسٹ جی اپنی گھڑی کی چابی کے چھلے کو گھماتے ہوئے۔ "آج شام کو میں آ کے بتا دوں گا۔"

وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام کے چھ بج گئے۔
سات بج گئے۔
آٹھ بج گئے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔
کرسٹ جی نہیں آیا، تو اندو کے دل میں تشویش پیدا ہونے لگی۔
اُس نے کرسٹ جی کے گھر پر، ملبار پر، ٹیلی فون کیا۔ معلوم ہوا کہ سالسٹر صاحب صبح سے غائب ہیں۔ پھر اندو نے پرنس اسٹریٹ، کرسٹ جی کے پرانے مکان پر ٹیلی فون کیا۔ جہاں اس کی بوڑھی ماں رہتی تھی۔ معلوم ہوا۔ صبح سے وہ واپس نہیں آیا ہے۔ اس سے ایک گونہ اندو کو اطمینان ہوا کہ وہ ضرور اسی کام میں لگا ہوگا۔ مگر اب یہ اندیشہ کھائے جاتا تھا۔
معلوم نہیں یہ کام ہوگا کہ نہیں!؟
کہ وہ خالی ہاتھ منہ لٹکائے واپس چلا آئے گا!
ان ہی اندیشوں میں گھری اندو سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے؟
کہ اتنے میں ڈور کی گھنٹی بجی۔
آج ڈنر پر غیر سبب یہ رہی کہ سر لوبن موجود نہیں تھے۔ ورنہ اس کا متفکر چہرہ میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر ضرور اس سے سوال کرتے۔ جلدی جلدی دو چار لوالے زہر مار کئے پھر سیڈنیز ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی۔ وہیں اس نے کافی منگوائی۔ کافی پیتے پیتے۔ کلیمر میگزین کے ورق الٹتے الٹتے وہ کرسٹ جی کا انتظار کرتی رہی۔
کرسٹ جی رات کے پونے دس بجے آیا۔ کتنا کا ماندہ، پریشان حال، آتے

ہی ایک گہرے صوفے میں دھنس گیا۔ اور سب سے پہلی بات اس نے وسکی کے لئے کہی۔

اندو نے وسکی کا ایک بڑا پیگ اسے بنا کے دیا۔

جسے وہ دو گھونٹ میں پی گیا۔

پھر الٹے ہاتھ سے منہ پونچھ کر بولا۔

"ایک اور بنا دو!"

"پہلے یہ بتاؤ کہ کیا کر کے آئے ہو؟"

"پہلے وسکی تو دو۔ جان میں جان تو آجائے!"

اندو وسکی کا دوسرا پیگ بنانے لگی۔ ہولے ہولے کورسٹ جی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ آواز میں بے حد تھکن تھی۔

"وہ پھوکرا۔ رنجیت۔ کسی طرح نہیں مانا۔ لاکھ لاکھ جتن کئے۔ ہر طرح کے لالچ دیئے مگر اُسے تو ایک ہی رٹ لگی تھی۔

"رانی بالا سے شادی تو ضرور کروں گا۔ اور اب یہ شادی تو ہر صورت میں ہو کے رہے گی!"

چنانچہ اس سے نا امید ہو کر میں رانی بالا کے پاس گیا۔ اس نے بھی صاف نا کر دی۔

پھر میں نے اس کی ماں کو سمجھایا۔ ماں بولی۔

"میں کیا کروں؟ لڑکی کے دل میں یہی بات سما گئی ہے۔ ویسے رنجیت بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور اب تو اس کے باپ نے بھی اجازت دیدی ہے۔"

جب تک اس کے باپ کو امید تھی کہ رنجیت کے ذریعے، وہ اندو کی وساطت سے سیٹھ بومن کی گاڑیوں کی مرمت کا ٹھیکہ اپنے گیراج کے لئے حاصل کر سکتا ہے۔ اسوقت تک اس نے رانی بالا اور رنجیت کی بات چیت کو اچھی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب ان

سے تم نے رنجیت کا خیال چھوڑ کر پھر سے سروجن کے گھر میں پناہ لی، اس کا باپ بھی تمہارا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے رانی بالا سے وعدہ کر لیا کہ اگر رنجیت نے اس سے شادی کر لی تو وہ رانی بالا کو اپنے گھر میں بہو بن کر آنے کی اجازت دیدیگا۔ یعنی جو بات وہ تمہارے لئے منظور کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اب رانی بالا کے لئے کرنے پر تیار ہے۔ محض تمہیں زک دینے کی خاطر! ـــــ ایک پیگ اور دینا "

"پھر کیا ہوا؟" اندو بڑی بے صبری سے بولی۔

"رانی بالا۔ اس کی ماں اور رنجیت سے ناامید ہو کر، میں اس بڈھے کے پاس گیا جو رانی بالا پر عاشق ہے۔ نرسنگھ داس اس کا نام ہے۔ اور کئی دھندے کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اگر تم مجھے پچیس ہزار روپیہ دو۔ تو میں یہ شادی منسوخ کرا سکتا ہوں!"

میں نے حامی بھر لی "

اتنا کہہ کر کرسٹ جی نے لمبا گھونٹ لیا۔

"بات ختم کب ہو گی؟" اندو نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔

"ایک منٹ میں!" کرسٹ جی دوسرا گھونٹ لے کر بولا "سارا دن مارا مارا پھرا ہوں پچیس ہزار اس بڈھے کو کمیشن دینا پڑا ہے۔ پچاس ہزار نقد رانی بالا کی ماں کو اور ایک گاڑی جس میں وہ رانی بالا کو سورت لے گئے ہیں!"

"سورت؟"

"ہاں! کمبخت کسی طرح مانتی نہیں تھی۔ نرسنگھ داس نے کوئی دوا کھلا کے اسے بیہوش کیا ہے۔ اور اب اسے اور اس کی ماں کو سورت لے کے گیا ہے۔ وہاں تین چار دن تو اسے ایسے ہی دوا کھلا کھلا کے بے ہوش رکھے گا۔ پھر ہوش آنے پر اسے سمجھا دے گا۔ پچاس ہزار کا فلیٹ اور ایک گاڑی دیکھ کر رانی بالا فوراً سے پہلے اس کی بات مان جائے گی!"

"اور اگر نہ مانی تو؟"

"شادی کی یہ تاریخ ٹوٹ ہی گئی"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے" اندو نے تلخ لہجے میں کہا: "شادی کے لئے کوئی دوسری تاریخ طے کی جا سکتی ہے۔ اس لئے تو میں پوچھتی ہوں کہ اگر رانی بالا نہ مانی تو؟"

"تو وہ مسورت سے واپس نہیں آئے گی!"

اندو کا سارا جسم کانپ گیا۔ اس نے ایک پل کے لئے نگاہ اٹھا کر کرسٹ جی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور جو کچھ وہاں دیکھا۔ اس سے خوف زدہ ہو کر اندو نے آنکھیں جھکا لیں۔

"اور اب میرا انعام؟" کرسٹ جی نے مسکرا کر کہا۔

اندو آنکھیں جھکائے کھڑی رہی۔ آگے بڑھ کر کرسٹ جی نے اندو کا ہاتھ تھاما جس کی انگلیاں برف سے زیادہ ٹھنڈی تھیں۔ پھر اس نے انگلیاں دبا کر اپنا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا۔ جو پتھر کی بنی تھی۔

پھر اس نے اندو کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا، جو بالکل راکھ تھا۔

پھر اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پہلے دن جس روز تمہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ تم سے شادی کروں مجھے اپنی زندگی میں اس سے بڑا انعام نہیں مل سکتا۔"

آخری

اب ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ دونوں پرنس اسٹریٹ سے کرسٹ جی کی بوڑھی ماں کا آشیرواد لے کر واپس کٹ پریڈ جا رہے تھے۔ جہاں وہ سربومن کو الوداع کہہ کر آج شام کے پلین سے سوئٹزرلینڈ اپنے ہنی مون کے لئے جانے والے تھے۔

اندو عروسی لباس پہنے غائب دماغ ہو کر نظارے کچھ دیکھ رہی تھی۔ اور کرسٹ جی بیحد خوش ہو کر بار بار اپنی دلہن کو دیکھ لیتا تھا۔

سربومن بھی بیحد خوش تھا۔ اس کی تو شروع ہی سے یہی آرزو تھی کہ اندو کرسٹ جی سے شادی کرے مگر لڑکی کا مزاج سمجھتے ہوئے اس نے خود سے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا تھا۔

آہستہ آہستہ حالات خود بخود ہموار ہوتے گئے اور جہاں کوئی الجھن پیدا ہوئی وہ اس نے اندو کو بتائے بغیر دور کر دی تھی۔ اس طرح کہ اندو کو مطلق پتہ نہ چل سکا۔ کہ کرسٹ جی اور اندو کی شادی میں سربومن نے خود کتنا بڑا حصہ لیا تھا؟!

گاڑی اب دھیرے دھیرے نئے فلائی وے کی طرف جا رہی تھی جو دھوبی تالاب اور پرنس اسٹریٹ کے علاقے کو سیدھے سیدھے میرین ڈرائیو سے ملا دیتا ہے۔ گاڑی چلانے والا کوئی نیا ڈرائیور تھا، شائد۔ جو نئی وردی پہن کر بے حد مشاقی اور چابک دستی سے اور احتیاط سے نئی کیڈی لک کو پھولوں سے سجی سنوری، خوبصورت نئی گاڑی کو فلائی وے کی چڑھائی پر لے جا رہا تھا۔ اندو نے کرسٹ جی سے پوچھا۔

"خورشید ہم ادھر سے کہاں جا رہے ہیں؟ میٹرو ہو کر چرچ گیٹ سے کیوں نہیں نکل گئے؟"

اندو نے اب اُسے خورشید کہنا شروع کیا تھا۔ کرسٹ جی جس کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

"ٹھیک تو جا رہا ہے!" کرسٹ جی نے جواب دیا۔ "یہ فلائی وے ہمیں سیدھا میرین ڈرائیو بند پر لے جائے گا۔ جہاں سے ہم کف پریڈ کو نکل جائیں گے۔ شارٹ کٹ ہے!"

"شارٹ کٹ ہے۔" ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے مڑے بغیر کہا۔ "لیکن کف پریڈ کو جانے والا شارٹ کٹ نہیں ہے۔ یہ موت کی طرف جانے والا شارٹ کٹ ہے۔"

اسی لمحے اس کے لہجے سے اندو سمجھ گئی۔ کہ اس کا کوئی نیا ملازم ڈرائیور نہیں ہے، یہ تو رنجیت ہے۔

"رنجیت!؟" اندو چلائی۔

جواب میں رنجیت نے اپنی ٹوپی ذرا سی اٹھائی۔ پھر اُسے ماتھے پر رکھ لیا۔ اور بولا۔ جس طرح آپ نے رانی بالا کو غائب کر دیا۔ اسی طرح میں نے چند منٹ پہلے آپ کے ڈرائیور کو غائب کر دیا۔ اور اب میں اس گاڑی کو فلائی وے سے کف پریڈ پر نہیں لے جاؤں گا۔ یہ گاڑی فلائی وے پل سے گذرتے ہوئی ٹاپ اسپیڈ پر آتی ہوئی

میرین ڈرائیور کے قریب ٹلائی دے پھاند کر سیدھے سمندر میں ڈوب جائے گی۔ ایک دوسرے کو گڈ بائی کر لیجئے!"

"تم پاگل ہو گئے ہو رنجیت!" اندو چیخ کر بولی۔ "جانتے نہیں ہو۔ میں صرف تم سے پیار کرتی ہوں!"

"پیار مجھ سے شادی کسی دوسرے سے؟ یہ پہیلی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ تو مجبوری تھی۔ کرسٹ جی سے شادی کر کے میں..... میں....." یکایک اندو نے خوف سے تھرّاتے ہوئے کرسٹ جی کی طرف دیکھا اور بڑی نفرت سے منہ پھیر لیا۔

میں نے سر لومن کی ساری جائیداد حاصل کر لی ہے۔ اب کیا ہے؟ یہ شوہر رہے گا۔ تم عاشق رہو گے!"

"ایک شوہر، ایک عاشق ——— ؟"

"ہاں!" اندو جلدی سے بولی۔ "اونچی سوسائٹی میں یہ پٹرن عام ہے۔"

رنجیت نے گاڑی کی رفتار ایکدم تیز کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ہاں۔ ہم غریب لوگوں میں یوں نہیں ہوتا۔ ہم جس سے پیار کرتے ہیں اسی سے شادی کر لیتے ہیں۔ اور شادی نہ ہو سکے تو اسے قتل کر دیتے ہیں یا خود مر جاتے ہیں۔ اس قصے میں ہم دونوں تو مر ہی رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ بے چارہ بھی مر رہا ہے۔"

کرسٹ جی کے فق چہرے پر اس کے زرد زرد ہونٹ ذرا سے کانپے اس نے گھبرا کر کہا۔

"تم مجھے تو اتار دو۔ پھر تم دونوں جو جی چاہے کرو۔ مگر مجھے ابھی اسی دم، اس گاڑی سے اتار دو!"

رنجیت زور سے ہنسا۔

"اب تو آپ کہیں نہیں جا سکتے۔ میاں بیوی کا تو جنم مرن کا ساتھ ہوتا ہے۔

سواب یہ ساتھ دیجئے!"

اتنا کہہ کر رجنیت نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔

گاڑی اب خطرناک رفتار سے فلائی وے پر بھاگی جا رہی تھی۔ نیچے گذرنے والے ٹریفک اور لوگ اور استری اور بچے اور بوڑھے مرد عورتیں دھبے دار رنگوں کی ایک تیز رفتار لکیر بنے ہوئے گاڑی کے نیچے سے گذرتے جا رہے تھے۔

روکو..... روکو..... رجنیت روکو!"

اندو نے چیخ مار کر کہا۔

گاڑی میرین ڈرائیور کے اوپر فلائی وے کو چیر کر تیر کی طرح فضا میں اوپر اٹھی۔

پھر ــــــ

چشم زدن میں سمندر کے اوپر لڑھکتی ہوئی نظر آئی۔ راہ چلنے والے لوگوں نے سانس روک کر اس خطرناک منظر کو دیکھا۔

گاڑی لڑھکتی ہوئی ایک خطرناک شور کے ساتھ سمندر میں جا گری۔ لہریں چاروں طرف اوپر اچھلیں!

یہاں تک بھی اندو نے دیکھا۔

اس کے قریب کی سیٹ پر کرسٹ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر رجنیت اب بھی سامنے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی سمندر کے اندر نیچے ہی نیچے چلی جا رہی تھی۔ ان دونوں کے چاروں طرف پانی کے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ رجنیت بڑے اطمینان سے ڈرائیور کی سیٹ پر اندو کی طرف پشت کئے سٹرنگ وہیل پر بیٹھا ہوا تھا۔

اندو نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے کو ہلا کر کہا۔

"کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

رنجیت چونک کر جاگ سا گیا۔
اندو کی طرف مڑ کر بولا۔
"کیا ہے؟"
"وہ بوتل ـــــ!" اندو جھلا کر بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو۔ اب ہم سے دور جا رہی ہے!"
واقعی وہ بوتل، جو اب تک ان کے قریب آ رہی تھی۔ ایک مخالف لہر سے ٹکرا کر،
اپنا رخ بدل کر،
جہاں دونوں بیٹھے تھے: اس سے ذرا اوپر جا رہی تھی۔
"جاؤ! اس بوتل کو نکال کر لاؤ!!"
اندو نے بڑی بے صبری سے کہا۔
"مجھے یقین ہے اس بوتل میں ضرور کوئی قیمتی شے ہو گی! ہیرے یا پھر کسی شہزادے کا خط!!
یا کسی بڈھے سیٹھ کی آخری وصیت!!!"
رنجیت نے تلخ لہجے میں کہا۔
"آخری وصیت ـــــ!"
اندو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
"کس کی وصیت؟ کس کی وصیت؟"
"تم نہیں سمجھو گی!"
رنجیت نے آہستہ سے کہا۔
"تم فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ فوراً اسے نکال کر

لاؤ ــــ!"

اندو خفا ہو کے چیخی۔

رنجیت پانی میں گھس گیا۔

چند منٹ کی کوشش کے بعد ــــ جس میں اس کے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ وہ بوتل کو کنارے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

کارک لگی بوتل کو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے باہر نکال کر دیکھا بوتل کے اندر کچھ نہیں تھا۔

"یہ تو خالی ہے!" اندو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں بالکل خالی ہے!!"

رنجیت نے ایسے مسرت بھرے لہجے میں کہا جیسے اُسے جہاں بھر کی دولت مل گئی ہو۔

پھر اس نے گھما کر بوتل کو زور سے سمندر میں پھینک دیا۔

اندو کو گہرا صدمہ سا محسوس ہوا، نا اُمید ہو کر اس نے گردن جھکا لی، بلکہ رنجیت سے بھی منہ موڑ کر بند کی دیوار پر بیٹھ گئی۔

عین اسی وقت بادل زور کڑکے اور بارش کی پہلی بوند اندو کے چہرے پر پڑی۔

اب وہ دونوں موا، سون کی زور دار جھڑی میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بارش کے تھپیڑے کھاتے ہوئے۔ سمندر کی اُچھال کا شور سنتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

رنجیت کا ہاتھ اندو کی کمر میں تھا۔ اور اندو کا ہاتھ رنجیت کی کمر میں۔ اور رنجیت اس سے کہہ رہا تھا۔

"اب میں سوچتا ہوں۔ بند پر بیٹھے بیٹھے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ ہمیں دیر نہ کرنا چاہیئے۔

مجھے اسّی روپیہ کی نوکری مل رہی ہے۔

تمہاری ماں کو نقد روپیہ کی!

تمہیں بھی ستر اسّی وہ دیدیں گے!!

کل ملا کے ہمارے پاس اتنی رقم ہو جائیگی ہم دونوں اپنی زندگی الگ شروع کر سکتے ہیں!"

اندو نے حیرت اور استعجاب، مسرّت اور بہجت سے شرابور نگاہوں سے رنجیت کی طرف دیکھا۔

رنجیت کے ہاتھ کی گرفت اندو کی کمر پر سخت ہوتی گئی۔

"ہم دونوں کا یوں سوچنا غلط تھا۔ خوشی بوتل میں بند ہو کر سمندر کی لہروں پر اچھلتی ہوئی کسی کو نہیں ملتی۔

خوشی کو اپنے ہاتھوں سے جننا پڑتا ہے۔

اِن دونوں ہاتھوں سے!!"

"اِن چاروں ہاتھوں سے!!!"

اندو نے رنجیت سے الگ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیئے۔

رنجیت نے پرشوق نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔ "ہم آج ہی۔ ابھی مہالکشمی کے مندر میں جا کر شادی کر لیں گے۔ پھر....."

"پھر؟"

اندو نے آہستہ سے پوچھا۔

اندو سرے پاؤں تک بارش میں بھیگ کر اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ انگ انگ سے رس ٹپک رہا تھا۔

رنجیت نے ایک پل اُسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر بے اختیار ہو کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میرین ڈرائیو پر اس وقت کوئی نہ تھا۔

سب کھڑکیاں بند تھیں۔

سارے راہ گیر جا چکے تھے۔ صرف وہ دونوں مون سون کے اس بپھرے ہوئے طوفان میں اکیلے، ایکدوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔

وہ طوفان کا حصّہ تھے۔

اور آسمان کا۔

دھرتی کا۔

اور اس کے ننگے بھیگے جذبوں کا.....

دُور تک جاتے ہوئے دو گیلے گیلے دھبّے!

منڈلاتے ہوئے بادلوں سے ٹوٹ کر آ جانے والے دو آبی ٹکڑے!!

پھر ــــ

زوردار بارش کا ایک بھنور سا ریلا آیا۔

پھر کچھ نہ رہا۔

ہر طرف بارش ہی بارش .....

ختم شد